قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۹ شمارہ: ۱

محرم الحرام: ۱۴۳۷ھ - نومبر: ۲۰۱۵ء

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی 74800، پوسٹ بکس نمبر 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر

بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرستِ مضامین

بصائر وعبر

سانحہ منیٰ.....اہل اسلام کے لیے عظیم صدمہ	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

اخلاص وخیر خواہی!	۱۰	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ
جاوید احمد غامدی، سیاق وسباق کے آئینہ میں (قسط:۱۲)	۱۳	مولانا فضل محمد یوسف زئی
علم اور اہل علم کی ضرورت واہمیت!	۲۳	مولانا محمد سعد کاندھلوی
حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہیدؒ	۳۳	مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
حلال فوڈ! امکانات وخدشات	۳۷	مفتی شعیب عالم
شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی وعرفانی مقام (قسط:۳)	۴۳	جناب محمد ظفر اقبال
محرم الحرام کا مہینہ! شرعی حیثیت، احکامات.....	۵۱	مفتی محمد راشد ڈسکوی
تعلیمی اداروں میں سزا کا اسلامی تصور	۵۹	مولانا سعید الحق جدون

دار الافتاء

''بیسی'' اور ''کمیٹی'' سسٹم کی شرعی حیثیت	۶۳	ادارہ

www.banuri.edu.pk

سانحہ منیٰ.....اہل اسلام کے لیے عظیم صدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

یہ دنیا دار الفناء اور آخرت دار البقاء ہے، یہاں جو بھی آیا ہے وہ جانے کے لیے ہی آیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

۱:''کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً وَّإِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ۔ (الانبیاء:۳۵)

ترجمہ:''ہر جی کو چکھنی ہے موت اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو اور ہماری طرف پھر کر آجاؤ گے۔''

۲:''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ۔'' (الرحمٰن:۲۶-۲۷)

ترجمہ:''جتنے (ذی روح) روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور صرف آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت والی اور احسان والی ہے باقی رہ جائے گی۔''

لیکن ہر ایک کے اس دنیا سے جانے کے اسباب مختلف ہوتے ہیں: کوئی بستر پر پڑے پڑے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کرتا ہے تو کوئی ہسپتال میں اپنی زندگی ہار بیٹھتا ہے۔ کوئی شراب کے نشہ میں دُھت اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو کوئی اپنی زبان ذکر اللہ سے تر رکھے ہوئے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔ کوئی عین نماز کی حالت میں سربسجود کیے ہوئے اپنے رب سے جا ملاقات کرتا ہے تو کوئی احرام کی دو چادریں پہنے ہوئے جنت کی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے اور قیامت میں حجاج کی صف میں کھڑے ہونے کا اعزاز اور تمغہ ابھی سے حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''تم جس طرح زندگی گزارو گے اسی طرح موت آئے گی اور جس طرح

موت آئے گی قیامت کے دن اسی حالت میں اُٹھائے جاؤ گے۔''

''کما تعیشون تموتون وکما تموتون تبعثون۔''

(روح البیان، سورہ آل عمران، ج:۲،ص:۱۲۵، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: ''جیسے تم زندگی گزاروگے ویسے ہی تمہاری موت آئے گی اور جیسے تمہاری موت آئے گی ویسے ہی تم (قیامت میں) اٹھائے جاؤ گے۔''

غزوۂ احد کے موقع پر آپ ﷺ کے سگے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور ان کا مثلہ کیا گیا، آپ ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: مجھے اگر اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے غمگین اور زیادہ افسردہ ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسی طرح چھوڑ دیتا، ان کو درندے اور پرندے کھاتے اور قیامت کے دن وہ بھی میرے چچا کی اس شہادت پر گواہی دیتے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''حدّثنا عبید اللّٰہ بن موسٰی عن أسامۃ بن زیدٍ عنِ الزھری عن أنسٍ قال: لمّا کان یوم أحدٍ، مرَّ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بحمزۃ وقد جدع ومثّل بہ، فقال: لولا أن تجد صفیّۃ لترکتہ حتّٰی یحشرہ اللّٰہ من بطون السّباع والطّیر، ولم یصلّ علی أحدٍ من الشّھداء، وقال: أنا شھیدٌ علیکم الیوم۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ، تخلیل اللحیۃ، ج:۱۴،ص:۲۶۰، ط: الدار السّلفیہ، الہند)

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں ایک صحابیؓ اونٹ سے گر کر فوت ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اغسلوہ بماء وسدر وکفنوہ فی ثوبین ولاتمسوہ طیبا ولاتخمروا رأسہ ولاتحنطوہ فإن اللّٰہ یبعثہٗ یوم القیامۃ ملبّیًا۔''

(صحیح البخاری، ج:۱،ص:۴۹۶، باب المحرم یموت بعرفۃ ولم یأمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن یؤدّی عنہ بقیۃ الحج، ط: الطاف اینڈ سنز، کراچی)

ترجمہ: ''اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو، دو کپڑوں میں کفن دو، خوشبو مت لگاؤ، نہ اس کے سر کو ڈھانپو اور نہ حنوط لگاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُسے تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھائے گا۔''

اس سال حج کے دوران حجاج کرام کو دو عظیم سانحات پیش آئے: ایک تو مسجد حرام میں کرین گرنے کا سانحہ جس میں دوسو سے زائد حجاج کرام شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے اور دوسرا منیٰ میں پیش آنے والا سانحہ، جس پر پورا عالم اسلام افسردہ، غمزدہ اور عظیم صدمہ سے دوچار ہوگیا ہے۔ ایک طرف دیکھا جائے تو اس میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے مسلمانوں کے لیے شہادت کے رتبہ کے ساتھ ساتھ عظیم انعامات اور بشارات ہیں، وہ آخرت کے اعتبار سے کامیاب لوگ شمار کیے جائیں گے، احرام کی حالت میں قیامت تک حج کا ثواب پاتے رہیں گے، طواف کررہے تھے تو ہمیشہ ان کو طواف کا ثواب ملتا

رہے گا، نماز میں تھے تو قیامت تک نماز کا اجر حاصل کرتے رہیں گے، لیکن دوسری طرف دیکھا جائے تو ان دونوں حادثات میں انسانی کوتاہیوں، گناہوں اور غلطیوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

جس دن حرم میں کرین گرنے کا حادثہ پیش آیا، یہ حادثہ عصر کی نماز کے بعد ہوا، اسی دن ظہر کی نماز کے بعد صفا کی طرف جانے والے ایک راستہ کو ڈیوٹی پر مامور پولیس اہلکاروں اور محافظین نے بند کر رکھا تھا، لیکن ایک جتھا آیا، اس نے دھکے دے کر ان رکاوٹوں کو دور کیا اور محافظین و پولیس اہلکاروں پر ہاتھ بھی اٹھائے، حالانکہ یہ تمام پولیس اہلکار اور محافظین حجاج کرام کی سہولت اور اُنہیں کے فائدہ کے لیے یہ تمام انتظامات کرتے ہیں، لیکن جب ان کے ساتھ ہاتھا پائی کی جائے اور ان کو دھکے دیے جائیں تو کیا اللہ تبارک وتعالیٰ کے غضب کو جوش نہیں آئے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے گھر کی بے حرمتی کرنے والوں اور اپنے گھر کے محافظین کا انتقام نہیں لیں گے؟

اس کے علاوہ آج کے حجاج کرام کی اکثریت اللہ کے گھر کی عظمت اور حرمت کو اتنا پامال کرتی ہے کہ ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اَبھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔ بے پردگی اور بے حجابی تو پہلے بھی تھی، لیکن موبائل آجانے کے بعد تقریباً ہر تیسرا چوتھا آدمی مسجد حرام اور مطاف میں مووی بناتا نظر آتا ہے، جس میں مرد و زن سب شامل ہیں اور مووی بھی اس طرح کہ بیت اللہ کی طرف پشت کی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کا رخ ہوتا ہے، جس سے بیت اللہ کی بے حرمتی اور بے وقعتی صریح لازم آتی ہے، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا عذاب نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟

رہا ۱۰/ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۴/ستمبر ۲۰۱۵ء کو پیش آنے والا منیٰ کا سانحہ‘ یہ بھی اچانک اور اتفاقی حادثہ نہیں ہے، اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والے اعمال اور عناصر کا ہی بڑا دخل ہے۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ: ایک ملک کے حجاج کا ایک جتھا جس کے باہر کمانڈو وزقسم کے مردوں کا حصار اور اس کے اندر عورتیں جو کافی دور اور دیر سے مختلف نعرے لگاتے ہوئے جمرات تک پہنچتے ہیں اور وہ حصار بدستور موجود ہے اور وہ اتنا مضبوط ہے کہ قریب کوئی اور حاجی جمرات کر ہی نہیں سکتا۔ ایک حاجی صاحب کے بقول کہ میں نے کوشش کی کہ میں اس جتھے سے بچ بچا کر جمرات کرلوں، لیکن وہ اتنا مضبوط اور اس کا بہاؤ اتنا زیادہ کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ مجھے ہی نہ روند ڈالیں، اس لیے میری کوشش ناکام ہوگئی۔ بہرحال جب یہ جتھا اسی طرح حصار بنائے جمرات پر پہنچا تو اس نے مختلف نعرے لگانے کے ساتھ ساتھ کنکریوں کو صرف سات تک محدود نہیں رکھا، بلکہ ہر ایک نے ایک تھیلی بھری ہوئی تھی جب تک وہ خالی نہیں ہوئی، وہ مسلسل کنکریاں مارر ہا تھا اور اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ کنکریوں سے فراغت کے بعد یہ جتھا اسی انداز میں واپس ہوا، جس انداز میں یہاں آیا تھا اور آگے جا کر بجائے مقررہ راستوں پر جانے کے، رکاوٹیں عبور کر کے غلط سمت کی طرف جانے کی کوشش کی، سعودی محافظین نے روکنے کے بہت جتن کیے،

لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور آگے نائجیر یا کا بھی ایک بڑا قافلہ آ رہا تھا، جس سے دونوں کا ٹکراؤ ہوا، اس پہلے جتھے کے کچھ لوگوں نے گرمی اور حبس کی وجہ سے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اس سے بھگدڑ مچی اور یہ سنگین حادثہ رونما ہوا، اس کے علاوہ اور بھی کئی عوامل اس میں کارفرما ہوں گے، لیکن ظاہراً یہی بتایا گیا، جس میں گیارہ سو سے زیادہ جانیں ضائع ہوئیں اور ابھی تک کئی سولا پتہ اور زخمی ہیں، لیکن اس حادثہ کے فوراً بعد ایک ملک کے ذمہ داران کے سعودی عرب کو دھمکی آمیز بیانات اور اس کے متصل ہی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس مسئلہ کو اٹھانا اور حرمین کو کھلا شہر قرار دینے کا مطالبہ کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ پلان اور منصوبہ بھی جزیرۂ عرب میں بپا شورش کو بھڑکانے کا حصہ تھا، جس کو سعودی عرب کی دانشمندانہ قیادت نے بڑے تحمل، برداشت اور بردباری سے کنٹرول کیا۔ ہماری اس بات کی تائید ۱۹/ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ، ۴/اکتوبر ۲۰۱۵ء بروز اتوار روزنامہ امت کے کالم نگار جناب امجد چوہدری کے کالم ''سانحہ منیٰ حادثہ یا سازش؟'' کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے' اس سے بھی ہوتی ہے، جناب موصوف لکھتے ہیں:

''خطے کی اس صورت حال کو مدنظر رکھا جائے تو سانحہ منیٰ میں سازش کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واقعہ اس بار پیش بھی ایسی جگہ آیا ہے جہاں بظاہر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، اس سے پہلے بھگدڑ کے واقعات جمرات پل پر پیش آتے رہے ہیں، لیکن اس بار یہ وہاں سے کچھ دور اس وقت پیش آیا جب شیطان کو کنکریاں مارنے کے بعد ایرانی حجاج کا ایک گروپ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف ہی پلٹ آیا اور چوک نما جگہ پر ان کا جمرات پل کی جانب بڑھنے والے حجاج سے ٹکراؤ ہو گیا۔ ایرانی حجاج کی شہادتیں زیادہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ اگر آپ سازشی نظریے سے دیکھیں تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ سعودیہ کو عدم استحکام کا شکار کرنے کی خواہش مند طاقتوں نے حجاج کے روپ میں اپنے چند تربیت یافتہ ایجنٹ بھیج دیئے ہوں، اتنے بڑے مجمع کو کسی غلط رخ کی جانب موڑنا تو ان ایجنٹوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوسکتا ہے۔ اس میں تو انہوں نے بس ایک ساتھ آوازیں لگا کر یا اشاروں سے ایک طرف رخ ہی متعین کرنا ہوگا، اس کے بعد تو لوگ خود ہی چل پڑیں گے۔ سعودی عرب کے پاس اسکیننگ کا تو کوئی نظام نہیں کہ وہ دیکھ سکے کہ جو ۲۵/لاکھ عازمین اس کی سرزمین پر آ رہے ہیں، ان کا پس منظر کیا ہے؟ شناخت بدل کر کوئی بھی ملک اپنے ایجنٹ عازمین کی صورت میں وہاں بھیج سکتا ہے۔ سازش ہونے کی سوچ کو سانحہ منیٰ کے بعد کے واقعات سے بھی تقویت ملتی ہے۔ افسوس ناک طور پر بعض ممالک نے اس معاملے پر غیر معمولی شور شرابا شروع کر دیا۔ سعودی عرب کو دھمکیاں تک دی گئیں۔ اس سے پہلے بھی حادثات ہوئے ہیں، لیکن اس بار جس طرح ردعمل ظاہر کیا گیا، یہ خطے کے حالات کا عکاس بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس پہلو کو بھی نظر انداز

www.banuri.edu.pk

نہیں کیا جاسکتا کہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق کیا گیا ہو، مثلاً اقوام متحدہ میں اس مسئلے کو اٹھانے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا، حتیٰ کہ مقامات مقدسہ کو عالمی تحویل میں دینے کے مطالبے کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ اس سانحے میں سازش کی بُو آنے کی ایک اور وجہ وہ خط بھی ہے جو برطانوی میڈیا میں اس حادثے کے فوراً بعد سامنے لایا گیا، ایک نامعلوم شہزادے کے حوالے سے شائع اس خط میں تقریباً وہی باتیں کہی گئیں جو سعودیہ کے دشمن کررہے ہیں، یعنی کہ سانحہ منیٰ کو جواز بناکر موجودہ سعودی قیادت کو ناکام قرار دیا گیا، خط میں سعودی شاہی خاندان کو شاہ سلمان کے خلاف بغاوت پر اُکسانے کی کوشش کی گئی، ایسا بھی پہلی بار ہوا ہے کہ حج پر کسی سانحے کے بعد سعودی شاہ کی معزولی کا مطالبہ سامنے لایا جائے اور وہ بھی ایک نامعلوم سعودی شہزادے کے حوالے سے۔ اب پتہ نہیں یہ خط تیار کرنے والا نامعلوم شخص شہزادہ ہے بھی یا نہیں، لیکن اس خط کا مقصد واضح ہے کہ سعودی شاہی خاندان میں اختلافات کے بیج بوئے جائیں۔ دشمن کی نظریں اب ہمارے مقامات مقدسہ پر ہیں۔ رب العالمین ہم پر رحم کرے اور مسلمانوں کو ان سازشوں کو سمجھنے اور انہیں ناکام بنانے کی سمجھ اور ہمت دے۔ ان مقامات کی حفاظت تو رب العالمین کریں گے، وہی رب جس نے ابرہہ کے لشکر کو پرندوں کے ذریعہ نیست و نابود کردیا تھا، لیکن ہماری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں، اگر امت مسلمہ نے یہ ذمہ داریاں ادا نہ کیں تو قیامت کے روز ہم پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے۔''

(روزنامہ امت، ۱۹؍ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ، ۴؍اکتوبر ۲۰۱۵ء بروز اتوار)

ہماری وفاقی حکومت کے وفاقی وزیر خزانہ جناب اسحاق ڈار صاحب نے بھی اپنے بیان میں کچھ اسی طرح کا اشارہ کیا ہے:

''اسلام آباد (خبرایجنسیاں) وفاقی وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے کہا ہے کہ سانحہ منیٰ میں ایک ملک کے لوگ ملوث تھے، بدھ کو پریس کانفرنس میں انہوں نے سانحہ منیٰ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس واقعے پر دل دکھی ہیں۔ پہلے حرم میں کرین گرنے کا واقعہ ہوا، اس میں بھی پاکستانی شہید ہوئے، اس کے بعد منیٰ میں سانحہ ہوگیا۔ وزارتِ خارجہ اور وزارتِ مذہبی امور کا سعودی حکام سے رابطہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں ملنے والی اطلاعات کے مطابق ایک ملک کے ۲۵۰؍افراد سے زائد پر مشتمل گروپ اُلٹا چلا تھا، جس کے نتیجے میں بھگدڑ شروع ہوئی اور سینکڑوں افراد شہید ہوگئے۔ وزیر خزانہ نے کسی ملک کا نام لینے سے گریز کرتے ہوئے کہا کہ یہ بین الاقوامی معاملہ ہے۔'' (روزنامہ امت، یکم اکتوبر ۲۰۱۵ء)

تمام شواہد دیکھنے کے بعد اس ملک کے وزیر صحت کو اعتراف کرنا پڑا کہ سعودی عرب منیٰ

حادثے میں بے قصور ہے:

''دبئی (امت نیوز/ ایجنسیاں) ایران کے وزیرصحت نے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای کے بیان کے برعکس منیٰ میں بھگدڑ کے دوران پیش آنے والے حادثے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس حادثے میں سعودی عرب کی حکومت کو قصوروار نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ العربیہ ڈی وی کے مطابق ایرانی وزیرصحت حسن ہاشمی نے اپنے سعودی ہم منصب انجینئر خالد بن عبدالعزیز الفالح سے جدہ میں ملاقات کے دوران منیٰ حادثے کے بعد سعودی حکومت کی جانب سے کیے گئے ہنگامی امدادی اقدامات کو سراہا، انہوں نے کہا کہ منیٰ میں بھگدڑ کے نتیجے میں پیش آنے والا حادثہ المناک ہے، مگر اس میں سعودی حکومت کا کوئی قصور نہیں..........'' (روزنامہ امت، یکم اکتوبر ۲۰۱۵ء)

بہرحال اللہ تبارک وتعالیٰ کے غضب سے ہر حال میں ڈرتے رہنا چاہیے، خصوصاً حج کے ایام میں اور ارضِ مقدس پر تو بہت زیادہ ڈرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جیسے یہاں دعائیں نقد اور فوری قبول ہوتی ہیں، ویسے ہی یہاں بے ادبی، گستاخی اور بے حرمتی کرنے پر گرفت بھی فوراً ہی ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ۔'' (الحج:۲۵)

ترجمہ: ''اور جو اس میں چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے اسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ ان چیزوں سے ہر ایک کو محفوظ فرمائے۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس، نائب رئیس، انتظامیہ اور تمام اساتذہ منیٰ کے سانحہ پر افسردہ ہیں اور سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان اور ان کے رفقاء ومعاونین سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور بھرپور حج انتظامات کرنے پر اُنہیں خراج عقیدت بھی پیش کرتے ہیں۔

....

حجاج کرام بتاتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا مطاف میں کنکریاں ہوتی تھیں جو پاؤں کو چبھتی تھیں۔ اسی طرح پینے کے لیے وافر مقدار میں پانی نہیں ملتا تھا، کچھ عرب بدو صراحی نما برتن لیے ہوئے ایک چھوٹی سی پیالی میں پانی ڈال کر دیتے اور پھر اس پر پیسے مانگتے تھے۔ اسی طرح جمرات پر ہر سال بھگدڑ مچتی تھی، کیونکہ ایک تو یہ ستون نما تھے اور جگہ کم ہوتی تھی اور دوسرا یہ کہ آنے اور جانے کا راستہ ایک ہوتا تھا۔ لیکن اب دیکھیں پانی ہر جگہ وافر مقدار میں موجود ہے، آپ مسجد الحرام سے مزدلفہ تک چلے جائیں، آپ کو جگہ جگہ ٹھنڈے پانی کے کولر لگے ملیں گے اور اوپر سے آبشار نما کھمبے آپ کے جسم وجان کو راحت پہنچانے میں مصروف ملیں گے اور اس پر مزید دس ذوالحجہ کو سعودی عرب کی پولیس اور فوج کے نوجوان ہر بزرگ حاجی اور کمزور آدمیوں پر ٹھنڈے پانی کی بوتلوں اور مشینوں کے ذریعہ اسپرے کرتے نظر آئیں گے۔ زمزم

حرمین میں وافر مقدار میں ملتا ہے۔ مسجد الحرام اور مطاف کی توسیع کو دیکھیں تو آدمی حیران ہوجاتا ہے، ابھی جو باب عبداللہ کی طرف نئی تعمیر ہوئی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور سنا ہے کہ ابھی دو تین سال مزید اس کی تکمیل، تزئین وآرائش میں لگیں گے۔ جمرات کی توسیع تو کثیر المنزلہ اور بہت زیادہ کشادہ کردی گئی ہے اور اوپر سے ہیوی قسم کے پنکھے لگادیئے گئے ہیں کہ آدمی وہاں بہت زیادہ ٹھنڈک اور تازگی محسوس کرتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جمرات تقریباً پانچ منزلہ بنائی گئی ہے اور ہر روڈ سے آنے والوں کے لیے الگ الگ منزل رمی کے لیے مقرر کی گئی ہے اور اگر کسی وقت کسی منزل پر رَش ہوجائے تو راستے میں لگی لائٹیں نشان دہی کرتی ہیں کہ ابھی رَش ہے، آپ جمرات کے لیے نہ جائیں۔ ان تمام انتظامات اور تعمیرات کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سعودی حکام نے حرمین شریفین کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھولے ہوئے ہیں اور اس پر کسی حساب وکتاب کی ان کو کوئی پرواہ نہیں۔

بہرحال حج کے حوالہ سے اس سال بھی سعودی انتظامات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی، الحمد للہ! ہر اعتبار سے تمام انتظامات بھرپور تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی ان خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور حرمین شریفین کو شریروں کے شر اور دشمنوں کی دشمنی سے محفوظ فرمائے، آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

اخلاص وخیر خواہی

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ

آج کل ہر جگہ نفسانفسی اور کشاکشی ہے، کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں، ہر ایک اپنے مفادات اور مقاصد کے پیچھے دوڑ رہا ہے، دین ومذہب اور اسلامی اخوت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے، مسلمان کے دل سے مسلمان کی خیر خواہی کا تصور مٹ گیا ہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار دُہرا کر فرمایا: ''دین اخلاص اور خیر خواہی کا نام ہے۔'' چنانچہ ترمذی شریف میں ہے:

> ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار دُہرا کر فرمایا کہ: ''دین اخلاص وخیر خواہی کا نام ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کس کی خیر خواہی؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی، اس کی کتاب کی، مسلمانوں کے حکام اور عام مسلمانوں کی۔''

''نصیحت'' عربی زبان میں بڑا جامع لفظ ہے جس کا ترجمہ اردو میں کسی مفرد لفظ سے کرنا مشکل ہے۔ اس کا مفہوم خلوص اور خیر خواہی کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے، یعنی جس کے ساتھ جو معاملہ ہو خلوص اور خیر خواہی پر مبنی ہو، اس میں کھوٹ اور ملاوٹ کا شائبہ نہ ہو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، اس سے شرک کی نفی کرنا، اس کی صفات میں کجروی اختیار نہ کرنا، اس کو تمام صفاتِ کمال وجلال کے ساتھ ماننا، اس کو تمام نقائص سے پاک اور منزہ سمجھنا، اس کی طاعت وبندگی بجالانا، اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنا، کسی سے صرف اس کی خاطر محبت اور بغض رکھنا، اس کے فرمانبرداروں سے دوستی اور اس کے نافرمانوں سے دشمنی رکھنا، اس کے ساتھ کفر کرنے والوں کے مقابلہ میں جہاد کرنا، اس کی نعمتوں کا اقرار کرنا اور ان پر شکر بجالانا، تمام امور میں اس سے اخلاص کا معاملہ کرنا،

تمام اوصاف مذکورہ کی دعوت اور ترغیب دینا اور تمام لوگوں سے ملاطفت کرنا۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص وخیرخواہی کا معاملہ کرنا درحقیقت خود بندے کا اپنی ذات سے خیرخواہی کرنا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی خیرخواہ کی خیرخواہی سے غنی ہیں۔

کتاب اللہ کے ساتھ خلوص وخیرخواہی کا مطلب ہے اس بات پر ایمان رکھنا کہ یہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا نازل فرمودہ کلام ہے، مخلوق کا کوئی کلام اس کے مشابہ نہیں، مخلوق میں کوئی اس کی مثل لانے پر قادر نہیں، قرآن کریم کی تعظیم کرنا، خوب اچھی طرح اس کی تلاوت کرنا، تلاوت کے وقت خشوع اختیار کرنا، تلاوت میں حروف والفاظ کو صحیح صحیح ادا کرنا، تحریف کرنے والوں کی غلط تأویلات اور طعنہ کرنے والوں کے طعن کا جواب دے کر قرآن کریم کی مدافعت کرنا، قرآن کے تمام مضامین پر ایمان رکھنا، اس کے احکام کو قبول کرنا، اس کے علوم وامثال کو سمجھنا، اس کے مواعظ سے نصیحت حاصل کرنا، اس کے عجیب مضامین اور پہلوؤں پر غور کرنا، اس کے محکم پر عمل کرنا، اس کے متشابہ کو تسلیم کرنا، اس کے عموم وخصوص اور ناسخ ومنسوخ کی تفتیش کرنا، اس کے علوم کا پھیلانا اور اس کی دعوت دینا۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اخلاص وخیرخواہی کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت ونبوت کی تصدیق کی جائے اور جو کچھ آپ ﷺ حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے لائے ہیں اس پر ایمان لایا جائے، آپ ﷺ کے امر ونہی کی اطاعت کی جائے، آپ ﷺ کی حیات میں بھی اور بعد از وفات بھی آپ ﷺ کی نصرت ومدد کی جائے، آپ ﷺ کے دوستوں سے دوستی اور آپ ﷺ کے دشمنوں سے دشمنی رکھی جائے، آپ ﷺ کی تعظیم وتوقیر کی جائے، آپ ﷺ کے طریقہ وسنت کو زندہ کیا جائے، آپ ﷺ کی دعوت کو پھیلایا اور آپ ﷺ کی شریعت کی نشر واشاعت کی جائے، اس پر کیے گئے اعتراضات کی نفی کی جائے، علوم شرعیہ کی تحصیل کو شعار بنایا جائے، ان میں تفقہ حاصل کیا جائے، ان کی دعوت وترغیب دی جائے، ان کی تعلیم وتعلم میں شفقت ولطف سے کام لیا جائے، ان کی عظمت وجلالت کو ملحوظ رکھا جائے، ان کی قراءت کے وقت ان کا ادب بجالایا جائے اور بغیر علم کے ان میں گفتگو کرنے سے رُکا جائے، علوم شرعیہ کے حاملین کا علم کی نسبت سے احترام کیا جائے، آپ ﷺ کے اخلاق وآداب کو اپنایا جائے، آپ ﷺ کے اہل بیت رضی اللہ عنہم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھی جائے، جو شخص آنحضرت ﷺ کی سنت کے مقابلہ میں کوئی بدعت ایجاد کرے یا آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نکتہ چینی کرے اس سے کنارہ کشی کی جائے اور اس نوعیت کے دیگر امور۔

ائمۃ المسلمین (مسلمانوں کے حکام) کی خیرخواہی یہ ہے کہ حق میں ان کی معاونت واطاعت کی جائے، ان کو حق کا حکم کیا جائے، لطف ونرمی کے ساتھ ان کو تنبیہ اور یاددہانی کرائی جائے، مسلمانوں کے

جن حقوق سے وہ غافل ہوں یا ان کے علم میں نہ آئے ہوں ان امور کی ان کو اطلاع دی جائے، ان کے خلاف بغاوت نہ کی جائے اور لوگوں کے قلوب کو ان کی اطاعت کی طرف مائل کیا جائے۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی خیرخواہی میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے، ان کی قیادت میں جہاد کیا جائے، ان کے پاس صدقات جمع کرائے جائیں اور اگر ان کی جانب سے ظلم و بے انصافی کا مظاہرہ ہو تب بھی ان کے مقابلہ میں تلوار سونت کر نہ نکلا جائے، ان کی جھوٹی تعریفیں اور خوشامدیں کر کے ان کا دماغ خراب نہ کیا جائے اور ان کے لیے صلاح و فلاح کی دعا کی جائے۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام تقریر اس صورت میں ہے جبکہ ائمۃ المسلمین سے خلفاء و حکام مراد لیے جائیں، یہی معنی زیادہ مشہور ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے ائمہ دین اور علمائے دین مراد لیے جائیں، اس صورت میں ان کی خیرخواہی کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کی روایت کو قبول کیا جائے، احکام شرعیہ میں ان کی پیروی اور تقلید کی جائے اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے۔

عام مسلمانوں کی خیرخواہی یہ ہے کہ ان کی دنیا و آخرت کے مصالح میں ان کی راہنمائی کی جائے، ان کی ایذاء رسانی سے بچا جائے، پس دین و دنیا کی جس چیز سے وہ ناواقف ہوں، اس کی ان کو تعلیم دی جائے اور اس میں قول و فعل کے ذریعہ ان کی اعانت کی جائے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے، ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کیا جائے، ان سے نقصان دہ چیزوں کو دفع کیا جائے، ان کے منافع کی تحصیل میں کوشش کی جائے، نرمی، اخلاص اور شفقت کے ساتھ ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا جائے، بڑوں کی عزت کی جائے، چھوٹوں پر شفقت کی جائے، عمدہ نصیحت کے ذریعہ ان کی نگہداشت کی جائے، ان سے کینہ اور حسد نہ کیا جائے، ان کے لیے خیر کی انہی باتوں کو پسند کیا جائے جن کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، اور ان کے لیے ان تمام چیزوں کو ناپسند کرے جن کو اپنے حق میں ناپسند کرتا ہے، ان کے مال و آبرو کی حفاظت کی جائے، خیرخواہی کی جو انواع اوپر بیان ہوئی ہیں ان کو ان کے اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے اور طاعات و عبادات میں ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

یہ وہ شمائل و خصائل ہیں جن کو اپنانے سے معاشرہ رشک ملائکہ بن سکتا ہے، مگر ہماری اس طرف توجہ نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو رہا ہے اور ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص و خیرخواہی عطا فرمائے اور حدیث نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

www.banuri.edu.pk

جاوید احمد غامدی

سیاق وسباق کے آئینہ میں (بارہویں قسط)

مولانا فضل محمد یوسف زئی

۴:.....تعلیم وتعلم میں

یہ غامدی صاحب کے منشور کا چوتھا بڑا عنوان ہے، جس کے تحت پندرہ دفعات مذکور ہیں۔ پہلا دفعہ یہ ہے:

’’پورے ملک میں تعلیم کا ایک ہی نظام رائج کیا جائے، تعلیمی نظام میں مذہبی وغیر مذہبی اور اردو یا انگریزی ذریعۂ تعلیم کی ہر تفریق بالکل ختم کردی جائے۔‘‘ (منشور:ص:۱۴)

تبصرہ:.....ایسا لگتا ہے کہ غامدی صاحب کو ملک پاکستان میں دینی مدارس کی مذہبی تعلیم آنکھوں میں کھٹک رہی ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کو نہ کوئی ہٹا سکتا ہے، نہ کوئی اس کا سوچ سکتا ہے۔ اسی طرح انگریزی ذریعۂ تعلیم کو بھی کوئی نہیں چھیڑ سکتا ہے، لہٰذا ان کے خیال میں مذہبی تعلیم اور اُردو ذریعۂ تعلیم دونوں بیکار ہیں اور یہی دونوں ان کے تیروں کا شکار ہیں، ورنہ اس دفعہ کا کوئی اور مفہوم نہیں بن سکتا ہے، کیونکہ جب اردو ذریعۂ تعلیم بھی نہ ہو، انگریزی ذریعۂ تعلیم بھی نہ ہو، مذہبی تعلیم بھی نہ ہو، انگریزی تعلیم بھی نہ ہو تو پھر اس ملک میں کیا رہ گیا؟ نہ معلوم غامدی صاحب اس دفعہ سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

دینی مدارس میں اصلاحات اور غامدی

اوپر بڑے عنوان ’’تعلیم وتعلم‘‘ کے تحت منشور کے دفعہ:۹ میں غامدی صاحب نے دینی مدارس کے بارے میں اصلاحات کی بات کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

’’اس وقت جو دینی مدارس ہمارے ملک میں موجود ہیں انہیں اصلاحات پر آمادہ کرنے کے ساتھ حکومت اپنے اہتمام میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعات قائم کرے۔ (منشور، دفعہ:۹،ص:۱۶)

تبصرہ:.....ایک طویل عرصہ سے حکومت پاکستان کے بڑے عہدے داروں، وزارت تعلیم کے نمائندوں

اور بڑے افسروں کی طرف سے آئے روز دینی مدارس کی اصلاحات کے لیے بیانات جاری ہوتے رہتے ہیں، اب پتہ چلا کہ اس فساد کی جڑ میں غامدی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، ان کو دینی مدارس کی اصلاحات کی اتنی فکر لگی ہے کہ اس کو اپنے منشور کا دفعہ بنا کر پیش کر دیا۔ حکومت نے ہمیشہ دینی مدارس کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے اور وقتاً فوقتاً ان پر ہاتھ بھی ڈالا ہے، کئی ایک مدرسوں کو بند بھی کیا ہے اور کئی مدارس پر چھاپے مار کر اس کے اساتذہ اور طلبہ کو گرفتار کر کے پریشان بھی کیا ہے اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔ سوات و بونیر اور وزیرستان اور دیر و باجوڑ پر فوجی چڑھائی کر کے ہزاروں مدارس کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ پچھلے دس سال تک جب فوجی آمر پرویز مشرف کی حکومت تھی تو اس نے غیر ملکی بے بس مظلوم طلبہ کو زبردستی ملک سے بھگا دیا اور آئندہ دین پڑھنے کے لیے باہر کی دنیا سے آنے والوں پر پابندی لگا دی، حالانکہ وہ طلبہ قانونِ پاکستان کے مطابق ویزہ لے کر آتے تھے۔

افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ دنیا کے ہر قسم کے کافر ہندو، یہودی، عیسائی، پارسی، بدھش بڑے اطمینان سے ہمارے ملک میں آکر کالجوں یونیورسٹیوں اور جامعات میں پڑھتے ہیں اور یہاں پڑے رہتے ہیں، نہ معلوم وہ ملک کے خلاف کس طرح سازشوں اور جاسوسیوں میں ملوث ہوتے ہوں گے اور ملک کے وقار و عظمت کو فحاشی کے ذریعہ سے کتنا نقصان پہنچاتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ اس لیے برداشت ہے کہ وہ بے دینی پڑھ کر واپس جاتے ہیں اور جو دین پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور ملک کی نیک نامی کا ذریعہ بنتے ہیں وہ ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں ہیں، حالانکہ دنیا کا بین الاقوامی قانون ہے کہ تعلیم ہر انسان کا حق ہے اور اس میں وہ آزاد ہے۔ اگر ایسا ہے تو پاکستان میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے والوں پر پابندی کیوں ہے؟ حالانکہ یہ ملک دین اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔

غامدی صاحب نے اس دفعہ: ۹ کی عبارت میں لکھا ہے کہ حکومت خود مہتمم بن جائے اور اپنے اہتمام کے تحت ماڈل مدرسے بنائے اور اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعات قائم کرے۔

تبصرہ:..... غامدی صاحب کی خواہش پر ان کے مرشد عام پرویز مشرف صاحب کے دور حکومت میں اس طرح ماڈل مدرسے بنائے بھی گئے، لیکن ''کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا'' والی بات صادق آ گئی اور ان کا کوئی قابل ذکر مدرسہ باقی نہ رہا، کیونکہ ''**ما كان لله يبقى وما كان لغيره يفنى**'' یعنی جو کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے اور جو غیر اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ فانی ہو جاتا ہے، چنانچہ ان ماڈل مدرسوں کے بنانے والے بھی نہ رہے اور وہ ماڈل مدرسے بھی نہ رہے۔ پرویز مشرف کو ملک سے بھاگنے کا موقع نہیں ملتا اور غامدی صاحب بھاگ کر ملائیشیا جا کر بیٹھ گئے۔ جن لوگوں نے دین اسلام کے طلبہ کو ویزہ ہونے کے باوجود زبردستی یہاں سے نکال دیا، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنے ملک سے بھگا دیا۔ میں پوچھتا ہوں غامدی صاحب دینی مدارس میں کیا اصلاحات چاہتے ہیں؟ جس مقصد کے لیے دینی

www.banuri.edu.pk

مدارس میں طلبہ آتے ہیں وہ مقصد پورا ہوجاتا ہے، علماء تیار ہوتے ہیں، امام وخطیب تیار ہوتے ہیں، مصنفین تیار ہوتے ہیں، داعی تیار ہوتے ہیں، خدا ترس اور متقی پرہیزگار علماء تیار ہوتے ہیں، مفتیان کرام اور قرآن کے حفاظ تیار ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مضبوط اور فعال کارکن تیار ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ حکومت کا ایک پیسہ بھی ان پر خرچ نہیں ہوتا، بلکہ اس ملک کی ایک بڑی آبادی کا بوجھ جو حکومت کے سر ہوتا ہے وہ یہ مدارس اٹھاتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں غامدی صاحب کیا اصلاحات چاہتے ہیں؟ کیا ان کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ ڈاڑھیاں کٹوائیں؟ پتلون پہن کر ٹائی لگا کر ڈانس شروع کردیں؟ اور زمانے کے سب سے زیادہ کرپٹ بن کر ملک کے لیے ناسور بن جائیں؟ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی مدد کا ہاتھ ان دینی مدارس پر ہے، ان میں بے شمار کمزوریاں سہی، پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی مدد کررہا ہے۔ غامدی صاحب آکر جمشید روڈ گرومندر میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی عالی شان عمارت اور صفائی اور نظم وضبط کو دیکھے اور پھر قریب میں اسلامیہ کالج کو جاکر دیکھے تو ان کی اصلاحات کا نقشہ بدل جائے گا۔ اسلامیہ کالج کی عمارت میں باہر سے جو کھڑکیاں ہیں وہ شاید دو ہزار تک ہوں گی، اگر اس میں ایک کھڑکی بھی سالم ہو اور اس کے پلّے لگے ہوئے ہوں تو آکر ہماری اصلاح کی بات کرے۔ الحمد للہ! دینی مدارس میں دنیا بھی آگئی اور دین بھی ہاتھ آیا اور غامدی صاحب کے مقبول جامعات میں نہ دین ہاتھ آیا اور نہ دنیا ہاتھ آئی۔ خلاصہ کے طور پر یہ بات کہہ دوں کہ دینی مدارس میں انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث پڑھائی جاتی ہے اور ان میں انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث بیٹھے ہیں اور دنیوی اسکول وکالج میں فرعون وہامان کی میراث سکھائی جاتی ہے اور فرعون کے وارث بن رہے ہیں، تو غامدی صاحب بتائیں کہ اصلاحات کہاں ہونی چاہئیں؟

دوسری بات یہ کہ دنیوی اسکول وکالج میں آج تک کوئی حافظ وعالم نہیں بن سکا، حالانکہ اس تعلیم پر اربوں روپے سرکاری خزانہ سے خرچ ہورہے ہیں، تو غامدی صاحب سوچ لیں کہ اصلاحات کی ضرورت کہاں پر ہے؟

غامدی صاحب اور مدارس کا داخلہ

غامدی صاحب اپنے منشور کے بڑے عنوان ''تعلیم وتعلم'' کے تحت دفعہ: ۱۲ میں لکھتے ہیں:

> ''ہندسہ اور طب کی جدید درسگاہوں کی طرح ان جامعات میں بھی صرف وہی طلبہ داخل کیے جائیں جو کم سے کم ایف اے یا ایف ایس سی تک اپنی تعلیم عام درسگاہوں میں مکمل کرچکے ہوں۔'' (منشور ص:۱۶)

تبصرہ:.....غامدی صاحب نے دینی مدارس کے داخلے کے لیے عجیب تجویز دی ہے، اگر اس کے آسرے پر مدرسوں والے بیٹھ جائیں تو شاید سال میں ایک آدھ داخلہ مشکل سے ہوگا۔ بھلا جو شخص ایف اے کرلے

وہ ملازمت کے چکر میں پھرے گا یا نورانی قاعدہ وناظرہ اوراعدادیہ میں فارسی قاعدہ، میزان الصرف اورنحومیر میں یہ بوڑھا آ کر بیٹھے گا؟ غامدی صاحب کی یہ عجیب تجویز ہے، مگرحقیقت میں غامدی صاحب تعلیم کی ترقی کا ارادہ نہیں رکھتا ہے، بلکہ ان مدارس کوایک چال کے ذریعہ سے بند کروانا چاہتا ہے، لیکن اس کی اس چال کے جال میں علماء کیا ایک مجنون شخص بھی نہیں پھنس سکتا ہے، لہٰذا منشور میں اس دفعہ کے لکھنے سے نہ لکھنا زیادہ بہتر تھا۔

غامدی صاحب دینی مدارس کونصاب دے رہے ہیں

غامدی صاحب اپنے منشور کے بڑے عنوان ''تعلیم وتعلم'' کےتحت دفعہ:۱۳ میں لکھتے ہیں:

''مدتِ تدریس پانچ سال ہونی چاہیےاوراس کا نصاب اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس میں محور ومرکز کا مقام قرآن مجید کوحاصل ہو، تدریس کی ابتداء اسی سے کی جائے اوراس کی انتہاء بھی وہی قرار پائے، علم وفن کی ہر وادی میں طلبہ اسے ہاتھ میں لے کرنکلیں اور ہر منزل اسی کی رہنمائی میں طے کی جائے۔نحو وادب، فلسفہ وکلام اور فقہ وحدیث کے لیے اسے معیار مانا جائے اور ہر چیز کے رد وقبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہو۔ایمان وعقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہو اور اسی پرختم کی جائے، طلبہ کو بتایا جائے کہ بُوحنیفہ وشافعی، بخاری ومسلم، اشعری وماتریدی اور جنید وشبلی سب پر اسی کی حکومت قائم ہے اوراس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جاسکتی ہے۔'' (منشور:۱۶)

تبصرہ:.....منشور کے اس دفعہ کی عبارت کافی لمبی ہے اورکئی جملے قابل گرفت ہیں۔سب سے پہلا جملہ کہ ''مدتِ تدریس پانچ سال ہونی چاہیے'' قابل گرفت ہے۔غامدی صاحب سے پوچھا جائے کہ یہ تدریس کیا چیز ہے؟ اگراس سے کسی مدرسہ کے مدرس کی تدریس مراد ہےتو کیا کسی مدرس کے لیے یہ ضروری ہے کہ پانچ سال تک تدریس کرے اور پھر ریٹائرڈ ہوجائے؟ یہ تجویز تو کسی عقل مند انسان کی نہیں ہوسکتی ہے اور نہ دنیا میں کسی قانون میں تدریس کے لیے مدت پانچ سال کسی نے مقرر کی ہے۔اگر غامدی صاحب نے تدریس کا یہی مطلب لیا ہےتو اس کی عقل وعلم، دانشوری اور پروفیسری پر ماتم کی ضرورت ہے۔اگر غامدی صاحب نے مدتِ تدریس سے طالب علم کے پڑھنے کا زمانہ مراد لیا ہےتو ان کومعلوم ہونا چاہیے کہ اس کو مدتِ تعلیم کہتے ہیں، مدتِ تدریس نہیں کہتے ہیں۔جوشخص تعلیم اور تدریس میں فرق نہیں کرسکتا ہے وہ پرلے درجے کا غافل ہے، اس کو قطعاً یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اکابر علماء اور مدرسین کو مشورے دیتا رہے اوران کے لیے نصاب تعلیم مقرر کرتا پھرے۔

غامدی صاحب! یہ قلمکاری اور مقالہ نگاری نہیں ہے کہ آپ اس میں چرب لسانی کا خوب جوہر دکھائیں، یہ علمی میدان ہے، یہاں سوچ سوچ کرعلم کی روشنی میں بات کرنی پڑتی ہے۔

غامدی صاحب نے یہ غلطی اپنے منشور میں بار بار کی ہے، اس سے پہلے منشور کے دفعہ دس میں لکھتے ہیں کہ ان جامعات میں تدریس کی ذمہ داری صرف ان اہل علم کو سونپی جائے۔ یہاں تدریس سے مدرس کی تدریس مراد لی ہے۔ غامدی صاحب کو معلوم نہ ہوسکا کہ عرف اور علماء کی اصطلاحات نے تعلیم کو متعلم وطالب علم اور تدریس کو مدرس کے ساتھ خاص کیا ہے۔ یہ علمی میدان ہے، اس میں کئی باریکیاں ہیں، صرف سر منڈانے سے آدمی قلندر نہیں بنتا، کسی نے خوب کہا ہے:

ہزار نکتۂ باریک تر ز مُو ایں جا است
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یعنی یہاں ہزاروں نکتے ہیں جو بال سے زیادہ باریک ہیں، ہر سر منڈوانے والا قلندر نہیں بنتا۔
ہم غامدی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ پانچ سال میں طالب علم کیا علم حاصل کرے گا؟ اور کیا عالم بنے گا؟ پھر آپ مشورہ دینے والے کون ہوتے ہیں کہ علماء کو مشورے دیتے ہیں؟ کوئی اچھا مشورہ ہوتا تو ایک بات ہوتی۔

آگے عبارت میں دوسرا جملہ یہ ہے کہ ''ہر چیز کے ردوقبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہو۔''

اس جملہ میں مکمل طور پر حصر ہے کہ کسی حکم کا قبول کرنا یا رد کرنا قرآن ہی سے ہو، اس طرح کے جملے منکرین حدیث نے انکار حدیث کے لیے پرانے زمانے سے استعمال کیے ہیں، قدیم وجدید منکرین حدیث کا یہ جملہ ہے: ''**حسبنا كتاب الله**''، یعنی ہمیں صرف قرآن کا حکم کافی ہے، کسی فقہ وحدیث کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جملوں کا جواب خود ارشاد فرمایا تھا جو مشکوٰۃ شریف کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ کی فصل ثانی کی تین احادیث میں مذکور ہے، ملاحظہ ہو:

ا:.....''**عن أبي رافع رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ألفين أحدكم متكئاً على أريكته يأتيه الأمر من أمري بما أمرت به أو نهيت عنه، فيقول: لا أدري، ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه۔**'' (رواہ احمد والترمذی وابوداود.....مشکوٰۃ، ص:۲۹، ط: قدیمی)

''حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے، کوئی حکم اس کے پاس پہنچے اور وہ (اسے سن کر) یہ کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ ہمیں خدا کی کتاب میں ملا ہم نے اس کی پیروی کی۔''

''**لا ألفين أحدكم**''، یعنی تم ایسی حالت میں مبتلا نہ ہوجاؤ کہ میں تم کو اس حالت میں پالوں۔

''متكئًا على أريكته ''، تخت شاہی کو ''أريكة'' کہتے ہیں جس کی جمع ''أرائک'' ہے۔ اس کو چھپرکھٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اس شخص کی نہایت غرور وتکبر کی کیفیت کا بیان ہے، نیز اس میں عیش وترفہ اور ناز ونعم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ''أمر'' یہاں مطلق دین اسلام مراد ہے، امر ہو یا نہی ہو یا کوئی اور حکم ہو۔

اس حدیث میں منکرین حدیث پر بلیغ رد وتردید ہے جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں اور جہالت کی وجہ سے احادیث کا انکار کرتے ہیں، نہایت غرور وتکبر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بس صرف قرآن ہی کافی ہے۔ اس کا مشاہدہ علماء حق نے اس وقت کیا تھا جب وہ وفد کی شکل میں عبد اللہ چکڑالوی منکر حدیث کے پاس گئے تھے، وہ چھپرکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور غرور کے ساتھ علماء سے کہہ رہا تھا ''حسبنا كتاب الله'' کہ بس ہمارے لیے صرف قرآن ہی کافی ہے۔

قرآن کی طرح احادیث بھی واجب العمل ہیں

۲:.....''عن المقدام بن معديكرب رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : ألا إني أوتيت القرآن ومثله معهٗ ألا يوشك رجلٌ شبعان على أريكته يقول: عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه وما وجدتم فيه من حرام فحرموه وإن ما حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم كما حرم الله ، ألا لا يحل لكم الحمار الأهلي ولا كل ذي ناب من السباع ولا لقطة معاهد إلا أن يستغني عنها صاحبها ومن نزل بقوم فعليهم أن يقروه وإن لم يقروه فله أن يعقبهم بمثل قراه۔'' (رواہ ابوداؤد... مشکوۃ، ص:۲۹، ط: قدیمی)

''اور حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا مثل، خبردار! عن قریب اپنے چھپرکھٹ پر پڑا ایک شخص کہے گا کہ اس قرآن کو اپنے اوپر لازم جانو (یعنی فقط قرآن ہی سمجھو اور اس پر عمل کرو) اور جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال جانو اور جس چیز کو تم قرآن میں حرام پاؤ اس کو حرام جانو، حالانکہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام فرمایا ہے وہ اس کے مانند ہے جسے خدا نے حرام کیا۔ خبردار! تمہارے لیے نہ اہلی (گھریلو) گدھا حلال کیا ہے اور نہ کچلی رکھنے والے درندے، اور نہ تمہارے لیے معاہد (یعنی وہ قوم جس سے معاہدہ کیا گیا ہو) کا لقطہ حلال کیا ہے، مگر وہ لقطہ حلال ہے جس کی پرواہ اس کے مالک کو نہ ہو اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی مہمانی کریں۔ اگر وہ مہمانی نہ کریں تو اس شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ مہمانی کے مانند اُن سے حاصل کرے۔

''أوتيت القرآن ومثلهٗ''، یعنی قرآن کی طرح احکام کے اثبات کے لیے مجھے احادیث بھی دی گئی ہیں۔ ہاں! فرق اتنا ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور احادیث وحی غیر متلو ہے۔ واجب العمل دونوں

ہیں، حلت وحرمت دونوں سے ثابت ہوتی ہے۔''رجــل شبعــان''اس لفظ سے اس شخص کی بلادت وحماقت وجہالت اور عیش وعشرت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ بھرے پیٹ والا بلید اور بے وقوف ہوتا ہے، لہٰذا وہ اس بلادت وجہالت کی وجہ سے احادیث کا انکار کرے گا۔

''وإن مـا حـرم: أي والحـال ما حرم رسول اللّٰہؐ کما حرم اللّٰہ''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اسی طرح چیزیں حرام ہوئی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات حقیقت میں اسی طرح شارع ہے جس طرح اللہ تعالیٰ شارع ہے:''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى''واضح آیت ہے۔

''ألا لا يـحـل''یہاں سے ان اشیاء کا بیان شروع کیا گیا ہے جن کی حرمت سنتِ رسول اللہؐ میں مذکور ہے اور قرآن کریم میں نہیں ہے، یہ کل چار چیزیں ہیں:

۱:- پالتو گدھا.....نہ کہ وحشی گدھا کیونکہ وہ صحرائی ہے اور حلال ہے، جس کو زیبرا کہتے ہیں۔ اب پالتو گدھے کی حرمت کا حکم حدیث میں ہے، قرآن کریم میں نہیں ہے۔

۲:- ذی ناب.....یعنی ڈاڑھوں اور کچلی سے شکار کرنے والے جانوروں کی حرمت کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، احادیث میں ہے۔

۳:- معاہد کا لقطہ استعمال کرنا، معاہد یا ذمی ہوتا ہے اور یا حلیف کافر ہوتا ہے۔ دونوں کے لقطہ کا حکم ایک ہے جو قرآن میں نہیں ہے، حدیث میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر ذمی مسلمان کا لقطہ استعمال کرنا بطریق اولیٰ حرام ہے۔ ہاں! معمولی چیز جو کوئی خود ہی پھینک دے یا گرنے کے بعد اس کے اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کرے وہ مستثنیٰ ہے۔

۴:- ومـن نـزل: یہ چوتھی چیز ہے کہ کوئی مسلمان کسی قوم پر اتر آیا تو اس قوم پر ان کی ضیافت واجب ہے، ورنہ ضیف اپنی ضیافت کی مانند ان لوگوں سے اس کا عوض لے لے۔ اس سے ذمی لوگ مراد ہیں جن پر بطور جزیہ مجاہدین کو کھانا کھلانا مقرر کیا گیا ہو، اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، حدیث میں ہے۔

۳:.....''عـن العرباض بن سارية رضي الله عنه قَـالَ: قَـامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَـقَالَ: أَيَحْسَبُ أَحَـدُكُـمْ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يَظُنُّ أَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا إِلَّا مَا فِيْ الْقُرْاٰنِ؟ أَلَا وَإِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ أَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ إِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْاٰنِ أَوْ أَكْثَرَ وَأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِإِذْنٍ وَلَا ضَرْبَ نِسَائِهِمْ وَلَا أَكْلَ ثِمَارِهِمْ إِذَا أَعْطَوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ۔'' (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، ص:۲۹، ط: قدیمی)

''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ کے لیے) کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ: کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے چھپرکھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے یہ

خیال کرتا ہے کہ خدا نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں؟ خبردار! خدا کی قسم! بلا شک میں نے حکم دیا، میں نے نصیحت کی اور میں نے منع کیا چند چیزوں سے جو مثل قرآن کے ہیں، بلکہ زیادہ ہیں، بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نہ یہ حلال کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں اجازت حاصل کیے بغیر چلے جاؤ اور نہ تمہارے لیے ان کی عورتوں کا مارنا حلال ہے اور نہ تمہارے لیے ان کے پھلوں کا کھانا جائز ہے، جب کہ وہ اپنا وہ مطالبہ ادا کردیں جو ان کے ذمہ تھا۔''

''أو أکثر'' یہ ''أو'' بمعنی ''بل'' ہے۔ یہ شک کے لیے نہیں، بلکہ پہلی وحی سے متصل دوسری وحی آئی تو ''بل أکثر'' فرمایا۔ علماء اصول نے لکھا ہے کہ احکام پر مشتمل قرآنی آیات پانچ سو ہیں اور اسی طرح احادیث بھی پانچ سو ہیں۔

''ولا ضرب نسائھم'' اس سے مراد مفتوح قوم کی عورتوں کے مارنے کی ممانعت ہے۔ نیز ان کے گھروں کی بے حرمتی کی ممانعت ہے، جیسا کہ عام فاتحین کی عادت ہوتی ہے۔

دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے احکام بہت سارے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں، لیکن احادیث سے ثابت ہیں، جس کی تفصیل حجیتِ حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے اور میں نے توضیحات میں بھی لکھ دی ہے۔

غامدی منشور کے اسی دفعہ میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''طلبہ کو بتایا جائے کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی سب پر اسی کی حکومت قائم ہے۔'' (منشور ص:۱۶)

تبصرہ: سب سے پہلے تو میں قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ غامدی صاحب کے اس گستاخانہ اور متکبرانہ انداز کو دیکھ لیجئے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو کس حقارت کے ساتھ بُوحنیفہ سے یاد کیا! امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو کس انداز سے ذکر کیا! فقہائے کرام، محدثین، متکلمین اور صوفیائے کرام کا اس انداز سے ذکر کیا جس طرح کوئی شخص اپنے نابالغ بچوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ آخر میں حکم لگادیا کہ سب پر قرآن کی حاکمیت اور حکومت ہونی چاہیے۔

میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو کب پتہ چلا ہے کہ یہ فقہاء اور محدثین اور متکلمین اور صوفیائے کرام قرآن عظیم کی حکومت نہیں مانتے ہیں اور انہوں نے اس طرح درس دیا ہے کہ ان کے پیروکار سمجھنے لگے ہیں کہ ان پر قرآن حاکم نہیں ہے، بلکہ یہ لوگ اپنا نو ایجاد دین بنا چکے ہیں اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور قرآن عظیم کو چھوڑ چکے ہیں۔ منکرین حدیث اور غیر مقلدین کی گفتگو کا یہی طریقہ ہے جس طریقہ سے غامدی صاحب نے قلم کی ایک جنبش سے سب کا صفایا کردیا اور بڑی

معصومیت کے ساتھ قرآن کی آڑ لے کر فقہ وحدیث اور تصوف کا انکار کر دیا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ غامدی صاحب نے غلط بیانی سے کام لیا کہ مقلدین حضرات قرآن کی حاکمیت کو نہیں مانتے ہیں یا محدثین و متکلمین اور صوفیاء اس مرض میں مبتلا ہیں۔ میں نے جو غامدی صاحب کے منشور کو دیکھا اور ان کی دیگر تصنیفات میزان، تبیان اور البرھان وغیرہ کو دیکھا تو مجھے تو بالکل واضح نظر آیا کہ قرآن عظیم کے کئی احکامات کے غامدی صاحب منکر ہیں اور کھل کر لکھ کر انکار کرتے ہیں۔ میں آئندہ سب کچھ واضح کرنا چاہتا ہوں، ابھی تو غامدی صاحب کے منشور پر گفتگو ہو رہی ہے۔ غامدی صاحب سمجھتے ہوں گے کہ میں ہاتھ کی صفائی سے سب کچھ غلط سلط لکھ دوں گا اور کسی کو پتہ نہیں چلے گا، ان شاء اللہ! ایسا نہیں ہوگا، غامدی صاحب جس صورت میں آئیں گے ہم ان کو پہچان لیں گے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

''تم جس رنگ کا لباس پہن کر سامنے آنا چاہو آؤ! میں تمہارے قد وقامت کے انداز کو خوب جانتا ہوں۔

منشور کے اس دفعہ کے آخر میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جاسکتی ہے۔'' (منشور:۱۶)

تبصرہ:.....غامدی صاحب کا خیال ہے کہ ان فقہاء و محدثین و متکلمین وصوفیائے کرام کے کلام میں ایسی چیزیں ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں، لہٰذا طلبہ کو بتا دینا چاہیے کہ قرآن کے خلاف کسی کی کوئی چیز قبول نہیں کی جاسکتی ہے۔ میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ ان حضرات کی کونسی چیزیں آپ کو مل گئیں ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں؟ وہ ہمیں بھی بتا دیجیے، تا کہ ہم بھی ان سے بچنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو صرف بے مقصد طعن اور طنز کیوں کرتے ہیں؟ اور لوگوں کو ان کے اسلاف سے بدظن کیوں کرتے ہیں؟ آپ خود ان اکابرین کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہو کر راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں اور شتر بے مہار بن کر ہدایت کی شاہراہِ اعظم کے بجائے گمراہی کی پگڈنڈیوں میں پریشان حال گھوم رہے ہیں، تو اور لوگوں کو کیوں تشکیک میں مبتلا کرتے ہیں؟

تعلیم وتعلم'' کے بڑے عنوان کے تحت دفعہ:۱۵ کے ضمن میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کا موجودہ طریقہ بالکل ختم کر دیا جائے اور ان جامعات سے فراغت کی سند کے لیے وہی درجہ مانا جائے جو مثال کے طور پر طب جدید میں ایم بی بی ایس کی سند کو حاصل ہے۔'' (منشور ص:۱۷)

تبصرہ:.....دینی مدارس اور جامعات میں آٹھ سال تک درس نظامی کا سلسلہ چلتا ہے، اس کے بعد اعلیٰ

درجات کی اعلیٰ تعلیم میں دورہ حدیث ہوتا ہے اور پھر یہ طالب علم فارغ التحصیل اور فارغ درس نظامی ہوکر عالم دین بن جاتا ہے۔ فراغت اور تقسیم اسناد کے اس موقع پر مدارس میں ایک رُوح پرور منظر ہوتا ہے، اکثر طلبہ کے رشتہ دار اور عام شہری جمع ہوجاتے ہیں، وہ ان طلبہ کی دستار بندی کو جب دیکھتے ہیں اور ان کو پھولوں کے ہار پہناتے ہوئے مخلص مسلمانوں کو بھی دیکھتے ہیں تو طلبہ کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ دیکھنے والے مسلمانوں کا جذبہ موجزن ہوجاتا ہے اور وہ اپنے بچوں کو دینی مدارس میں دینی تعلیم دلانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ غامدی صاحب کو اسلامی مدارس کی یہ شان وشوکت برداشت نہیں، ان کو یہ اعلان گوش گزار کرنا بھی برداشت نہیں کہ اس سال جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک سے ڈیڑھ ہزار طلبہ فارغ ہوگئے، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے چھ سو طلبہ اور دارالعلوم کراچی کورنگی سے پانچ سو یا کم وبیش طلبہ عالم بن گئے۔ چونکہ یہ پر رونق سلسلہ اہل حدیث غیر مقلدین کے ہاں نہیں ہے تو ان کے ہاں فارغ وغیر فارغ کا ظاہری طور پر کوئی فرق بھی نہیں اور نہ وہاں یہ شان وشوکت ہوتی ہے۔ غامدی صاحب جہاں کئی دیگر روحانی بیماریوں میں مبتلا ہیں وہیں پر یہ غیر مقلد بھی ہیں، اس لیے اپنے منشور میں جو کچھ لکھا یہ ان کے دل کی آواز ہے، لیکن میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ختم کردیا جائے تو پھر کس اصول اور کس قانون کے مطابق ان طلبہ کو اعلیٰ ڈگری ایم بی بی ایس کے مساوی سند عطا کی جائے گی؟ کیا یہ خیانت نہیں ہے کہ پڑھا نہیں ہے اور جعلی سندِ فراغت اس کو عطا کی گئی اور اس کے نام کے ساتھ سند یافتہ عالم مساوی M.B.B.S لکھ دیا گیا؟

افسوس اس بات پر ہے کہ عصری تعلیم کی مروجہ جامعات اور کالجوں سکولوں میں جو بے قاعدگیاں ہورہی ہیں، مخلوط تعلیم سے جو فحاشی پھیلائی جارہی ہے اور ان جامعات کے اندر دوران تعلیم جو اخلاق سوز واقعات رونما ہورہے ہیں، اس کی اصلاحات کے لیے غامدی صاحب نے اپنے منشور میں کچھ نہیں لکھا، اگر لکھا تو دینی مدارس کا پیچھا کرکے لکھا، ایسا لگتا ہے کہ غامدی صاحب کے قلم کو اللہ تعالیٰ کسی نیک راستے میں استعمال ہونے نہیں دیتا ہے، حالانکہ غامدی صاحب نے اپنے منشور کی پیشانی پر لکھا ہے: ''اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف'' تو کیا دورِ حاضر یہی دینی مدارس اور اسلامی احکامات ہیں؟

من از بیگانگاں ہر گز نہ نالم
کہ با ما ہر چہ کرد آشنا کرد

''میں بیگانہ لوگوں کی وجہ سے ہرگز نہیں روتا ہوں، کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ اپنوں نے کیا۔''

(جاری ہے)

علم اور اہل علم کی ضرورت واہمیت!

مولانا محمد سعد کاندھلوی

میرے محترم دوستو، عزیزو! زندگی کے ہر شعبے کو حکم پر لاؤ، حکم پر اُس وقت آسکو گے جب ہر شعبہ کا علم حاصل کروگے، جتنی جہالت ہوگی اُتنا ہر شعبہ غیروں کے طریقوں پر جاوے گا۔

پاکستان، علماء اور مدارس کا چمن

اللہ نے تمہیں علم اور علماء کا ملک عطا فرمایا ہے، کیسا مدارس کا چمن یہ ملک ہے، اس پر جتنا شکر کرو کم ہے، کس طرح اللہ نے بڑے بڑے علماء کرام اور مفتیانِ عظام تمہیں دیئے ہیں، خدا نہ کرے، خدا نہ کرے! اگر ان سے اِستفادہ کا عزم نہ کیا اور ان سے تعلق قائم نہ کیا تو یہ بہت بڑی ناشکری ہوگی اور بہت بڑی نعمت کو ٹھکراؤ گے، کیونکہ دُنیا میں ایسے ایسے ممالک بھی ہیں، جہاں پورے ملک میں کوئی کلمہ سکھانے والا اور کوئی مسائل بتانے والا نہیں ہے، اللہ نے تمہیں علماء اور مدارس کا ملک عطا فرمایا ہے۔

علم اور علماء سے نفرت کرنا کفر ہے

اس لیے بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ علماء کی زیارت کو عبادت یقین کرو، علماء کی صحبت کو اپنی اوّلین ضرورت سمجھو، علماء سے محبت کرنا علم سے محبت کرنا ہے، اور علماء سے نفرت کرنا علم سے نفرت کرنا ہے اور علم سے نفرت کرنا اور نماز سے نفرت کرنا برابر ہے اور نماز سے نفرت کرنا کفر ہے، کفر ہے، کفر ہے۔

علم کی فرضیت

خدا کی قسم! علم اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ ہر مؤمن مرد وعورت کے ذمہ علم کا حاصل کرنا اسی طرح فرضِ عین ہے جس طرح نماز کا پڑھنا فرضِ عین ہے۔ مدارس کی طرف رُخ کرو اور اپنے بچوں کو دینی مدارس میں داخل کرو۔

ہر وہ عمل اللہ کے یہاں قبول ہوگا جو علم کے مطابق ہو۔ اتنا ایمان کا سیکھنا ہر مؤمن کے ذمہ فرضِ عین ہے کہ جو اس کو اللہ کی پہچان کرائے۔ اسی طرح اتنا علم سیکھنا ہر مؤمن کے ذمہ فرضِ عین ہے جو اس کو

حرام حلال کی تمیز کرا دے۔ ہاں! محدث بننا، فقیہ بننا، مفسر بننا یہ فرضِ کفایہ ہے، یہ ہر ایک کے ذمہ فرض نہیں ہے۔ علماء کی مجالس اور علماء کی صحبت سے فائدہ اُٹھاؤ، قدم قدم پر علماء سے پوچھ کر چلو۔ لیکن اس خیال میں رہنا کہ میں تو بظاہر جو کر رہا ہوں ٹھیک ہی کر رہا ہوں (یہ غلط فہمی ہے) یاد رکھو کہ اللہ کے یہاں کوئی عمل جہالت کے ساتھ قبول نہیں ہوگا، اور نہ جاننا اللہ کے یہاں عذر نہیں ہے کہ اللہ! مجھے تو معلوم نہیں تھا، جہالت عذر نہیں ہے، چونکہ اللہ نے سکھانے کے لیے رسول کو بھیج دیا: ''أَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۔'' (الفاطر:۳۷)..... ''کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں وہ شخص سمجھ سکتا تھا جو سمجھنا چاہتا اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔'' یہاں تک کہ میرے دوستو! کوئی عمل اخلاص کے ساتھ بھی علم کے بغیر قبول نہیں ہوگا۔ ایک آدمی بڑا مخلص ہے، لیکن جہالت کے ساتھ عمل کر رہا ہے تو اللہ کے یہاں قبول نہیں ہوگا۔

ہر نئی معلومات علم نہیں ہے

سب سے پہلے یہ سمجھو اور اُمت کو سمجھاؤ کہ علم کیا ہے؟ اہل باطل نے دھوکہ دہی سے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ ''اگر تم نے صرف قرآن اور حدیث کو علم سمجھا تو تم بہت پیچھے رہ جاؤ گے، تمہیں دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ دیکھو! صرف قرآن وحدیث علم نہیں ہے بلکہ سائنس بھی علم ہے، ڈاکٹری بھی علم ہے، انجینئرنگ، تجارت، دنیا کی خاک چھاننا اور اسباب کی تحقیق کرنا یہ بھی علم ہے، تم صرف قرآن وحدیث ہی کو علم نہ سمجھنا، یہ میں وہ بات کہہ رہا ہوں جو غیروں نے ہمیں سکھلائی ہے۔ میرے دوستو! عزیزو! آج اس بات کا سمجھانا بڑا جہاد ہے، بڑا جہاد ہے، بڑا جہاد ہے۔ ورنہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس زمانے میں نوجوانوں کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ صرف قرآن وحدیث علم نہیں، بلکہ دنیوی فنون اور اس کی معلومات کا حاصل کرنا یہ بھی علم کا حصہ ہے، لہٰذا جس علم سے ہمارا معاش متعلق ہے اس علم کو اہم درجہ دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اولادیں سترہ اٹھارہ بیس پچیس سال تک پہنچ جاتی ہیں انہیں کچھ خبر نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور کون سا علم ہم پر فرض ہے، چونکہ انہیں یہ سمجھا دیا گیا کہ علم معاش کے حصول سے تمہاری زندگی متعلق ہے، اس لیے وہی علم ہے اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ معاش سے متعلق جو نام نہاد علم مجھ پر فرض کیا جا رہا ہے، یہ ایسا اندھا کنواں ہے کہ جس میں سمجھ دار بھی ڈوب رہے ہیں اور ناسمجھ بھی، یہاں تک کہ موت آجاتی ہے اور بے دینی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، ہائے افسوس!!!!

میرے دوستو! عزیزو! باطل نے اپنے فنون کو علم قرار دے کر اُمت مسلمہ کو علم سے کاٹ دیا ہے اور یہ باور کرا دیا کہ جو چاہو سیکھو سب علم ہے، نہیں میرے دوستو! ہرگز نہیں، علم صرف وہ ہے جو اللہ ہم سے چاہتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے چاہتے ہیں، صرف وہ علم ہے، سارا علم قبر کے تین سوالات پر محدود ہے: ''من ربک، من نبیک، ما دینک ''گویا کہ علم نام ہے: ''ربوبیت کا علم، شریعت کا علم اور

www.banuri.edu.pk

سنت کا علم‘‘، جو کچھ اس کے سوا ہے وہ علم نہیں ہے اور اس پر علم کی حدیثوں کو فٹ کرنا بڑی حماقت ہے۔

دنیوی فنون کی رغبت کے لیے احادیث علم کو فٹ کرنا گمراہی ہے

یہ تو گمراہی ہے کہ دنیوی فنون کے لیے علم کی احادیث کو استعمال کر کے دنیوی فنون کی رغبت پیدا کی جائے، میرے دوستو! عزیزو! یہ بڑی گمراہی ہے۔

موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ

یہ کہنا ہے کہ ’’جدید آلات واسباب نے علماء سے مستغنی کردیا‘‘ اس لیے میں بار بار کہتا رہتا ہوں کہ علم علماء کی صحبت سے حاصل کرو، آج لوگ کہتے ہیں کہ آلات واسباب نے علماء سے مستغنی کردیا کہ ہم تو علم خود ہی حاصل کرلیں گے کہ اب تو سارا علم آلات پر آگیا ہے، کیا ضرورت ہے علماء کی؟ یہ اس زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ ہے کہ اُمت کو اپنی دینی رہبری کے لیے علماء کی ضرورت نہ رہے، اس لیے میں اہتمام سے کہہ رہا ہوں کہ علماء کی زیارت کو عبادت یقین کرو اور اپنی اولادوں کو دینی مدارس میں داخل کرو، ورنہ میرے دوستو! عزیزو! اُمت اس دھوکہ میں پڑ چکی ہے کہ بھئی سب کچھ علم ہے، جو چاہو سیکھو۔ نہیں میرے دوستو! ہرگز نہیں، علم صرف وہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر اللہ ہم سے چاہتے ہیں، صرف اس کو علم کہتے ہیں۔ غیروں کے تجربات کو علم سمجھنا سب سے بڑی جہالت ہے۔

نئی پود کی جہالت کی وجہ

میرے دوستو! عزیزو! اس بات کو تسلی، سنجیدگی اور بہت ہی ٹھنڈے دماغ سے سمجھنا ہوگا، میں نئی پود کی جہالت کی وجہ بتارہا ہوں کہ اگر ان کو یہ سمجھا دیا جاتا کہ یہ (قرآن وسنت) علم ہے، وہ (عصری ذرائع) فن ہے، تب بھی معاملہ آسان تھا کہ یہ دونوں چیزوں کو حاصل کرلیتے، دنیوی فنون کو اپنی دنیوی ضرورت کے لیے اور علم اِلٰہی کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کو سمجھایا گیا ہے کہ علم یہ نہیں، علم یہ ہے، اور یہاں تک سمجھا دیا گیا کہ جو علم اِلٰہی ہے وہ علماء سے متعلق چیز ہے، وہ علماء سمجھتے ہیں سمجھاتے ہیں، ہم سے متعلق جو علم ہے یہ تو دنیا کا علم ہے۔

اپنی جہالت کا احساس کب ہوگا؟

جب تک علم اور فن کے درمیان فرق نہیں کیا جاوے گا اُس وقت تک اپنی جہالت کا احساس نہیں ہوگا اور علم اِلٰہی کے حاصل کرنے کی فکر اور رغبت نہیں پیدا ہوگی، یہ بات اچھی طرح یاد رکھیں کہ علم صرف وہ ہے جو ہم سے ہمارا رب چاہتا ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ علم میں لگنا اس بات کی توفیق میں لگنے کو کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارا رب کیا چاہتا ہے؟ مخلوق ہم سے کیا چاہتی ہے؟

اس میں لگنے کو تو کہیں بھی علم نہیں کہا گیا۔

دنیوی فنون کو علم صرف قارون نے سمجھا ہے

میری بات ذرا غور سے سننا! اگر دُنیوی فنون کو علم سمجھا ہے تو وہ صرف قارون نے سمجھا تھا، اسی قارونیت پر ہم سب چل رہے ہیں، کیونکہ جب اس سے یہ کہا گیا کہ یہ اللہ نے تجھے جو کچھ دیا ہے اس میں دارِ آخرت کی جستجو کرتا رہ اور دنیا میں سے اپنا حصہ فراموش مت کر اور اس میں اللہ کے حکم کے مطابق چل ''وَابْتَغِ فِيمَا أٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْأٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا '' تو اُس نے کہا کہ یہ سب کچھ مجھے میرے علم کی وجہ سے دیا گیا ہے: ''قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهُ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ''، جس علم کو قارون علم کہہ رہا ہو، اس کو ہم بھی علم کہیں؟ یہ ہماری جہالت نہیں ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟ قارون کا یہ کہنا کہ ''إِنَّمَا أُوْتِيْتُهُ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ '' یہ بتلا رہا ہے کہ یہ قارون کا علم ہے، کسی نبی کا علم نہیں کہ جو کچھ مال میرے پاس ہے یہ میں نے اپنے فن اور علم سے کمایا ہے، یہ اللہ نے نہیں دیا ہے، ہمیں علم اور فن میں فرق کرنا ہوگا، تاکہ ہمارے دلوں میں اس علم کی اہمیت پیدا ہو جس کو اللہ نے ہم پر فرض کیا ہے جس کو علم شریعت کہتے ہیں۔

ہم دنیوی فنون کی تحصیل سے نہیں روکتے

دیکھو! ہم دنیوی فنون سیکھنے سے نہیں روکتے، بالکل نہیں روکتے، یہ ایک ضرورت ہے، جس چیز کی جو اہمیت ہے اس کو اس کے درجہ میں رکھنا چاہیے، لیکن دنیوی فنون کو حاصل کرنے کے لیے ان حدیثوں کا استعمال جو محض علم الٰہی کے لیے ہیں، یہ انتہائی بے وقوفی کی بات ہے۔

توریت کے مطالعہ کی خبر پر نبی پاک ﷺ کا غصہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک بار یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمیں یہ بھی تو معلوم کرنا چاہیے کہ ہم سے پہلے نبیوں پر کیا احکامات نازل ہوئے تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توریت اور انجیل پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور کچھ اوراق ہاتھ میں لیے آپ ﷺ کے سامنے حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے پوچھا: یہ ہاتھ میں کیا ہے؟ (جواب دیا کہ:) یا رسول اللہ! میں نے توریت پڑھی ہے، تاکہ ہماری معلومات میں اضافہ ہو کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا احکامات نازل کیے تھے؟ آپ ﷺ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر اتنا غصہ آیا کہ آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم جمع ہوگئے، اتنا آپ کو غصہ تھا کہ انصار تلواریں لے کر آگئے کہ آپ کو کس نے ستایا ہے؟ سارا غصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر تھا کہ ''عمر! نے توریت کیوں پڑھی ہے؟ جو قرآن میں لے کر آیا ہوں، جو علم سنت اور طریقت وشریعت میں لایا ہوں، کیا عمر کی نجات کے لیے یہ کافی نہیں ہے؟'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''لو كان موسىٰ حياً لما وسعه إلا اتباعي ''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفصل الثانی، ج:۱، ص:۳۰، قدیمی)..... ''اگر آج موسیٰ زندہ ہو کر آجائیں تو ان

کی نجات بھی میرے طریقہ پر ہے۔'' یعنی اگر تم نے اب موسیٰ کا طریقہ اختیار کیا تو گم راہ ہو جاؤ گے۔

بہت خطرے کی بات

آپ غور کریں اور اندازہ کریں کہ ایک اتنا بڑا عالم عمر (رضی اللہ عنہ) کہ جن کا مقام یہ ہے کہ ''**لو کان بعدی نبیًا لکان عمرؓ**'' کہ ''میرے بعد اگر نبوت کا دروازہ کھلا ہوتا تو عمرؓ نبوت کی استعداد رکھتے ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ اللہ کی کتاب کو سمجھنے والے تھے، اس درجہ کا صحابیؓ سب کچھ سیکھنے کے بعد توریت پڑھ رہا ہے، توریت بھی وہ پڑھی جو پہلے نبی کا علم شریعت تھا، اللہ کی طرف سے ایک نبی پر نازل ہوا تھا، اُس پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ آنکھیں سرخ ہوگئیں، تو آپ اندازہ کریں کہ جو علم، علم تھا، لیکن اب منسوخ ہوگیا، اس کی تحصیل کی خواہش پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر آپ کو اتنا غصہ آیا تو جو علم سرے سے علم ہی نہیں دنیوی فن ہے، اگر مسلمان اس زمانہ میں اسے علم الٰہی سے جاہل ہوکر حاصل کر کے اپنے آپ کو عالم سمجھیں اور علم کی حدیثیں اس پر فٹ کریں تو ایسے لوگوں پر قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر غصہ آئے گا اندازہ کرلیا جاوے۔

ہمیں دعوت کے ذریعہ ایمان کی طرح علم کی بھی ضرورت ہے

ہمیں جس طرح دعوت سے ایمان کی ضرورت ہے، اسی طرح دعوت کے ذریعہ سے علم کی بھی ضرورت ہے اور علم کو بھی اخلاص چاہیے جو ہمارے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کرے، کیونکہ جس دل میں اللہ کا خوف نہیں ہے وہ عالم نہیں ہوسکتا، اسے اسلام کی معلومات ضرور ہوں گی، لیکن وہ عالم نہیں ہوسکتا۔

عالم وہ ہے جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو

عالم کے لیے تو شرط ہے کہ اس کے دل میں اللہ کا خوف ہو، کیونکہ اللہ نے حصر کے ساتھ فرمادیا: ''إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ'' علم تقویٰ کا نام ہے، علم زندگی کے تمام شعبوں میں چوبیس گھنٹے اللہ کے حکموں کا پابند ہوکر چلنے کا نام ہے۔ فرمایا: علم دو قسم کا ہے: ''**العلم علمان : علم فی القلب فذاک علم النافع وعلم اللسان فذاک حجة اللّٰه لابن آدم**''.... علم دو قسم کا ہے: زبان کا اور دل کا۔ زبان کا علم وہ ہے جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ جو انسان کے لیے قیامت کے دن مصیبت بنے گا، اس کے خلاف حجت بنے گا اور دل کا علم وہ ہے جو ابن آدم کو نفع دے گا۔ علم کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ کا خوف پیدا ہو، علم کے ذریعہ خشیت پیدا ہو وہ علم الٰہی ہے، سب سے بڑا عالم وہ ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو، اس لیے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! سب سے بڑا عالم بننا چاہتا ہوں، فرمایا: ''اتق اللّٰہَ تکن أعلم الناس'' کہ ''تقویٰ اختیار کرو، تم سب سے بڑے عالم ہو جاؤ گے۔'' علم اللہ کی صفت ہے، وہ اللہ سے تعلق کے بقدر حاصل کیا جاتا ہے۔

اللہ والا علم علماء کے پاس امانت ہے

اللہ والا علم ہر عالم کے پاس امانت ہے، امانت پہنچانے والا معاوضہ نہیں لیا کرتا، یہ تو اس کے ذمہ ہے، جس طرح ڈاکیہ ڈاک پہنچاتا ہے، اس کی تنخواہ حکومت کے ذمہ ہوتی ہے، اسی طرح میرے دوستو! عالم کا معاوضہ اللہ کے ذمہ ہے۔

جب اُمت میں دین سیکھنے کے لیے خرچ کرنے کا جذبہ نہ رہے تو اب علماء پر ذمہ داری ہے کہ اُمت کو ہر حال میں دین سکھلایا جائے اور اس کا معاوضہ نہ لیا جائے: ''**لَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا، لَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا** ''، علم کو پہنچاؤ اُمت کی امانت سمجھ کر۔لیکن کسی غلط فہمی میں نہ رہیے کہ اگر کسی کو دین پھیلانے، قرآن سکھلانے اور علم سکھلانے کی تنخواہ ملتی ہے تو یہ اس کے پڑھانے کا ہرگز بدل نہیں ہے، بلکہ یہ اس مشغلہ کا بدل ہے جس مشغلہ کو چھوڑ کر یہ عالم دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے اور وہ عالم بھی اس کو دینی خدمت کا بدل کبھی نہ سمجھے۔علم سکھلانے کا کوئی بدل نہیں سوائے جنت کے۔ظاہر بات ہے یہ ایک انسان ہے، اس کے ساتھ ضروریات لگی ہوئی ہیں، اس کو دنیا میں کوئی مشغلہ بھی کرنا تھا، تجارت بھی کرنی تھی، لیکن اس نے تجارت اور دیگر معاشی کاموں کو چھوڑ کر بچوں کو پڑھانے میں اپنا وقت لگایا تو یہ اُس مشغلہ کا بدل ہے جس کو چھوڑا گیا ہے۔

اگر علم اسباب پر موقوف ہوگیا تو امت کا بڑا طبقہ جاہل رہے گا

آج کتنا پیسہ شادیوں پر خرچ ہورہا ہے، لیکن علم کے حصول پر خرچ کے لیے ہم تیار نہیں، تو کیسے جہالت ختم ہوگی؟ اور بغیر جہالت کے ختم ہوئے عبادت قبول ہے نہ اعمال، کچھ نہیں، علم حاصل کرو، تاکہ عبادتیں کامل ہوجائیں۔عبادت کا کمال علم سے ہے، عبادت پر استقامت یقین سے ہے اور عبادت کی قبولیت اخلاص سے ہے۔

اگر علم اسباب پر موقوف ہوگیا تو امت کا بڑا طبقہ جاہل رہے گا، کیونکہ وہ بھی جاہل رہیں گے جن کے پاس سیکھنے کے اسباب نہیں اور وہ بھی نہیں سکھلائیں گے جن کو معاوضہ نہ ملے، اجرت تو اس وقت کی ہے جو وقت تعلیم کے لیے فارغ کیا گیا ہے۔

علماء کی ذمہ داری

علماء کی ذمہ داری بھی بتلادی، علماء کیا کہتے ہیں کہ: ''جی جاہل تو سیکھتے ہی نہیں، آتے ہی نہیں ہمارے پاس کہ ہم سکھلاویں!'' نہیں میرے دوستو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: علماء جاہلوں کو دین سکھلاویں، علماء جاہلوں کی تربیت کریں اور اُن کو دین پر آمادہ کریں اور علماء عوام کو دین کی تعلیم دیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے تو یہ بہت بڑی بات تھی، چونکہ جس بات کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمادیا

ہے اس کا جو اثر اس وقت تھا، قیامت تک کے لیے اس کا وہی اثر ہے، یہ بات نہیں ہے کہ وہ سیکھنے آئیں تو سکھلا دیں گے۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ ہم سے سیکھتے ہی نہیں، ہم کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ اپنی بات کو دہرایا، مطلب یہ تھا کہ اگر وہ سیکھنے نہیں آتے تو میرے تمہارے ذمہ ہے کہ ان کو جا کر سکھلاویں۔

تبلیغ اور تعلیم میں کوئی فرق نہیں ہے

اس لیے تبلیغ اور تعلیم میں کوئی فرق نہیں ہے، آنے والوں کو سکھلانا بھی شعبہ ہے اور جا کر سکھلانا بھی شعبہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک آیت کی تبلیغ کا بھی حکم دیا ہے۔ جا کر تعلیم دو، یہ تبلیغ ہے۔ آنے والوں کو تعلیم دو، یہ تعلیم ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم دونوں کاموں میں برابر لگے رہتے تھے۔

علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث کیوں ہیں؟

یادرکھنا کہ علماء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث اُس طریقۂ تعلیم کے ساتھ قرار دیا گیا ہے جو طریقۂ تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا کہ وہ تعلیم نقل وحرکت کے ساتھ ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ علماء اپنے کام چھوڑ کر نکلیں، امامت، خطابت، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور شعبہ افتاء چھوڑ کر نکلیں، نہیں! ہم یہ نہیں کہتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی یہی فرمارہے ہیں، اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ ایمان والوں کو چاہیے کہ سب یک بارگی نہ نکلیں: ''مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً'' کہ ایمان والوں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ سب یک بارگی نکل جاویں: ''فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ'' ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایمان والوں کی جماعت کا ایک حصہ اللہ کے راستہ میں نکلے۔ کیوں نکلیں؟ دیکھو عجیب بات ہے، اس آیت میں فرمایا ہے: ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ'' دین کے اندر کمال اور سمجھ پیدا کرنے کے لیے نکلیں، لازم ہے کہ واپس آکر مقام پر علم کو پھیلاویں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''علماءِ صحابہ رضی اللہ عنہم'' کو حرکت پر رکھا تھا، تاکہ اُمت میں کہیں بھی جہالت پیدا نہ ہو، اور علم صرف طلب والوں کے اندر محدود نہ ہوجاوے کہ یہ پڑھنے کے لیے آئے ہیں، پڑھ لیویں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے علم کی مثال بادل سے دی ہے اور بادل میں حرکت ہے۔ آپ علماء کرام تو ہلکی بات کرنے لگے ہیں کہ بھئی ہم تو کنواں ہیں، پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا، نہیں! ہرگز نہیں، ایسی بات نہیں ہے، علماء کو انبیاء علیہم السلام کا وارث قرار دیا گیا ہے اور انبیاء علیہم السلام نے نقل وحرکت کے ذریعے علم کو پھیلایا ہے۔ اور علم کی مثال بادل سے دی ہے، جو زمین کسی قابل نہیں، جس زمین میں اگانے کی صلاحیت نہیں اس پر بھی بادل برستا ہے، اپنے علم کو لے کر حرکت میں آؤ کہ اُمت کو علم پہنچانا ہے اور دعوت سے اپنے علم کے اندر رسوخ پیدا کرنا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علماء کا مرتبہ

ایک بار حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی زین العابدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ: ''مفتی صاحب! ایک جماعت ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ اُس جماعت کو لے کر آپ جائیں، کیوں کہ اُس میں بڑے بڑے علماء اور بڑے بڑے اہلِ کمال آئے ہیں۔''

آج ہمارا حال یہ ہے کہ انگریزی دان دیکھ کر جماعت کو اُن کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ خط بھی آتا ہے کہ یہ پروفیسر صاحب ہیں، انگریزی جانتے ہیں، یہ جماعت چلالیں گے۔ معیار گھٹتے گھٹتے اعداءِ دین کی زبان پر آ گیا۔ کہاں معیار تھا صحابہ رضی اللہ عنہم کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمیر طے کرنے کے لیے مشورہ نہیں کیا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاتفریق ہر ایک کے پاس الگ الگ بیٹھے اور ہر ایک سے الگ الگ قرآن سنا، جس کا قرآن سب سے اَچھا تھا فرمایا کہ: ''تم ہی ان سب کے امیر ہو، اس لیے کہ امام ہی امیر ہوتا ہے'' فرمایا: ''تمہاری امامت وہ کرے جو زیادہ علم رکھنے والا ہو، شریعت کو جو زیادہ جاننے والا ہو'' یہ نہیں کہا کہ تم میں تجربہ زیادہ کس کا ہے؟ تم میں سے انگریزی کس کو زیادہ اچھی آتی ہے؟

سنت طریقہ یہ تھا کہ تم میں سے اچھا قرآن کون پڑھ سکتا ہے؟ پہلے اس بات کا اہتمام ہوتا تھا اور ایسے ساتھی جماعت کے ساتھ لگائے جاتے تھے جو اُن کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں۔

تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی زین العابدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ: ''میرا دل چاہتا ہے کہ تم جماعت لے کر جاؤ!'' پھر فرمایا کہ ''تین دن بعد جماعت آئے گی'' جواباً مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ: ''تین دن کے لیے خانقاہِ رائے پور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جانا چاہتا ہوں''، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''ضرور جاؤ!'' علماء اور مشائخ کی خدمت میں دُعا اور اِستفادہ کی غرض سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ ساتھیوں کو بھیجا کرتے تھے، لیکن فرمایا کہ: ''دیکھو! ٹھیک تین دن کے بعد آ جانا''، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چلے گئے، تین کے بجائے پانچ دن گزر گئے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ: ''مفتی زین العابدین صاحب تین دن کے لیے رائے پور گئے تھے، پانچ دن گزر گئے، اَب تک نہیں آئے، اِدھر جماعت اُن کا انتظار کر رہی ہے۔'' حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سہارن پور سے رائے پور تشریف لے گئے اور جاتے ہی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ: ''تین دن کے بعد اب یہاں کیا کر رہے ہو؟''، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ: ''حضرت! مجھے تو نظام الدین ہی جانا ہے، لیکن مجھے یہاں کے قیام میں کچھ ایسی کیفیت اور ذکر کے ایسے انوار حاصل ہو رہے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ ایسی کیفیت اور ایسا موقع پھر حاصل ہو نہ ہو، اس لیے میں نے یہاں کا وقت بڑھا لیا، مجھے یہاں کی خلوت میں جو کیفیت حاصل ہو رہی ہے اُس کیفیت نے یہاں روکے رکھا'' بہرحال پھر تشریف لے گئے۔

دعوت کی محنت کا مقصد اُمت سے جہالت کو ختم کرنا ہے

علم کی دعوت کے ذریعے جہالتیں ختم ہوں گی اور اُمت علماء سے جڑے گی۔ اس محنت کا مقصد جہالت کو ختم کرنا ہے، یہ محنت تو اُمت میں علم کے حصول کی طلب پیدا کرتی ہے، جب یہ محنت ہوگی تو یہ احساس ہوگا کہ ہمیں علماء کی ضرورت ہے، علماء کی صحبت ومجالست اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور یہی اس دعوت کا مقصود ومطلوب ہے۔

تمام دنیوی شعبوں میں دین کیسے زندہ ہوگا؟

میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ علماء آدھے دن دینی کاموں میں لگیں اور آدھے دن تجارت بھی کریں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہ دینی کاموں کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔

ساری دنیا ہوگی جاہلوں کے ہاتھ میں اور ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمارا کام صرف پڑھانا ہے، آج ہم نے سارا بازار اور ساری تجارت جاہلوں کے حوالہ کردی ہے، جب تک ہم تجارتوں، زراعتوں، حکومتوں کو اور دنیا جہان کے تمام سرمایہ داری کے نقشوں کو یہ سمجھ کر چھوڑے رکھیں گے کہ یہ ہمارے کرنے کے کام نہیں ہیں، تو خدا کی قسم! اس میں کبھی دین نہیں آسکتا، کیسا مزا آوے کہ ایک عالم آدھے دن پڑھاتا ہو اور آدھے دن خود عملی طور پر بازار جاکر دیکھے کہ جو علم میں پڑھا رہا ہوں اس کے مطابق تجارت ہورہی ہے یا نہیں؟ یہ کتنے بڑے نقصان کی بات ہے کہ ایک آدمی تجارت کا علم حاصل کرے اور اس کے محلّہ کا بازار علم کے مطابق نہ ہو، اگر ایسا نہ کیا گیا تو جو حرام راستہ کی کمائیاں ہیں وہ سب علم وعمل کو لے ڈوبیں گی۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ: ''ہم تجارت چھڑوانا نہیں چاہتے بلکہ تجارت کو حکم پر لانا چاہتے ہیں، ورنہ وہ ہوگا جو قوم شعیب کے ساتھ ہوا۔'' حکم پر لانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ عملی طور پر ان شعبوں کا علم لے کر ان میں داخل ہوں۔

دین کے کسی شعبہ کا انکار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکامات کا انکار ہے

اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے، دین کے کسی شعبے کا انکار یا اس کا استخفاف یا اس کی افادیت سے انکار کہ مثلاً: مدارس سے کیا ہوگا؟ یہ بھی ایک مرض اور بیماری پیدا ہوگئی ہے لوگوں میں، میرے دوستو! عزیزو! غور سے سن لو! جو اس کام میں رہتے ہوئے دین کے کسی شعبے کا انکار کرے خدا قسم! وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دو کاموں میں سے ایک کا انکار کررہا ہے، پکی بات ہے، بالکل سچی بات ہے، کیونکہ اس کام کو کسی خیر کے کام کے معارض سمجھنا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے کاموں میں سے ایک کام کو دوسرے کے معارض سمجھنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صفت ''صفتِ جامعیت'' ہے، یہ جامعیت اپنے اندر پیدا کرو، کیونکہ اس محنت سے پورا دین وجود میں آنا ہے، اس لیے حرام ہے ہمارے لیے یہ سوچنا کہ ''اس شعبے سے

کیا ہوگا؟ اُس شعبہ سے کیا ہوگا؟'' جتنے دین کے شعبے ہیں یہ دعوت کی آمدنی ہے، لوگ اپنی آمدنی کو سنبھال کر رکھتے ہیں کہ دعوت کی محنت سے لوگوں میں علم کی طلب پیدا ہو، مساجد قائم ہوں، مدارس قائم ہوں، تربیت گاہیں قائم ہوں، دین کے شعبے وجود میں آنے ہیں دعوت کے کام سے، یہ تو ہونہیں سکتا کہ دعوت کے کام ہوں اور دین کے شعبے مقصود نہ ہوں، یہ ایسا ہے کہ کوئی آدمی تجارت کرے اور کہے کہ مجھے آمدنی مقصود نہیں ہے یا آمدنی کو ضائع کردے، وہ کیسا بے وقوف آدمی ہوگا؟ لوگوں کو اپنی آمدنیوں سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ وہ اس کو خون پسینہ کہتے ہیں کہ یہ میرا خون پسینہ ہے۔

دعوت سے دین کے سارے شعبے زندہ ہونے ہیں اور یہ میری بات یاد رکھنا کہ یہ شعبے اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک دعوت کی نقل و حرکت قائم رہے گی۔ آپ ذرا پچھلا زمانہ اُٹھا کر دیکھیں ساری تاریخ اس کی گواہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر صحابیؓ کو معلم بنایا تھا: ''**بلغوا عنی ولو آیة**'' جب علم، نقل و حرکت سے الگ ہو جاوے گا تو عام اُمت میں جہالت پھیل جاوے گی اور علم اُمت کے ایک محدود طبقہ کی چیز بن کر رہ جاوے گا، اگر علم کے بغیر نقل و حرکت ہے تو جاہلانہ نقل و حرکت ہوگی۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ: میرا دل یہ چاہتا ہے کہ جتنی جماعتیں نکلیں ان میں ایک عالم ہو اور ایک قاری ہو، تاکہ نکلنے والے قرآن سیکھ کر آویں۔

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

حضرت الاستاذ مولانا محمد حبیب اللہ مختار دہلوی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے آباء واجداد متحدہ ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ موجودہ ''کے، پی، کے'' کے پشتون قبائلی علاقے سے ہجرت کرکے کسی زمانے میں ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی میں وارد ہوئے اور کئی پشتوں سے وہیں آباد رہے، بعد میں آپ کی دہلوی شناخت، نسبی قبائلی شناخت پر غالب آگئی اور آپ کا خاندان دہلوی کہلانے لگا، چنانچہ آپ کے والدگرامی حکیم مختار حسن خان حاذق دہلوی سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ کے ہاں ۱۹۴۴ء کو دہلی ہی میں ایک ہونہار فرزند ارجمند کی ولادت ہوئی، جس کا نام انہوں نے ''حبیب اللہ مختار'' تجویز کیا، دہلی کے علمی، تاریخی اور ثقافتی ماحول میں آنکھ کھولنے والے یہ ہونہار فرزند اپنی عمر عزیز کے تیسرے سال میں اپنے والدین اور خاندان کے ہمراہ ۱۹۴۷ء کو دہلی سے ہجرت کرکے کراچی آکر آباد ہوئے۔

حکیم مختار حسن خان دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاندانی رسوم وآداب کے تحت سن شعور میں داخل ہوتے ہی اپنے اس ہونہار فرزند کے لیے گھر کے دینی ماحول کے ساتھ ساتھ درسگاہ کے تعلیمی ماحول کا انتظام بھی فرمایا اور اس وقت کراچی کی دینی درسگاہوں میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ دارالعلوم نانک واڑہ (جو بعد میں دارالعلوم کراچی کہلانے لگا) میں ابتدائی دینی تعلیم دلائی، ۱۹۵۴ء میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن (حال جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی) قائم ہوا تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی تکوینی وروحانی کشش حضرت حکیم مختار حسن خان رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار فرزند کو بنوری ٹاؤن میں کھینچ لائی، انہوں نے درس نظامی کے درجات علیا کی تکمیل بنوری ٹاؤن میں فرمائی، ۱۹۶۳ء میں سند فراغت حاصل کی اور مولوی محمد حبیب اللہ مختار دہلوی بن کر درس نظامی سے فارغ التحصیل ہوئے، پھر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے فقہ اور حدیث میں تخصص کی طرف رُخ موڑا اور دونوں موضوعات میں خداداد صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھلائے۔ دارالافتاء میں مفتی

اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کے زیرتربیت علمی وتحقیقی فتاویٰ کی تمرین کی اور حضرت مولانا علامہ محمد عبدالرشید النعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے زیرسایہ تخصص فی الحدیث کیا اور ''السنة النبوية والقرآن الكريم '' کے عنوان سے حجیتِ حدیث پر وقیع علمی وتحقیقی مقالہ تحریر فرمایا، جس کے امتیازی نمبرات کی بنا پر آپ تخصص فی الحدیث کی سند کے اعزاز سے نوازے گئے۔

۱۹۶۶ء میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حکم پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور چار سال تک وہاں زیرتعلیم رہے، وہاں چار سالہ نصاب مکمل کر کے ۱۹۷۰ء میں واپس جامعہ تشریف لائے، اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں جامعہ کراچی سے ایم، اے اسلامیات کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۸۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی (P.H.D) کی ڈگری بھی حاصل کی، ساتھ ساتھ افتاء کی تمرین اور تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گرویدگی کے دوطرفہ تعلق کے نتیجہ میں روحانی فرزندی کے بعد ۱۹۷۲ء میں نسبتی فرزندی کا اعزاز بھی پایا، اور حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کے فرد اور جامعہ کے ایسے رکن رکین بن گئے کہ اپنی خاکستر ہڈیاں بھی حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں جامعہ کی مٹی کے سپرد کروائیں!

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جامعہ سے وابستگی کا آغاز مدرس اور رفیق دارالتصنیف کی حیثیت سے ہوا، تدریس کے میدان میں ابتدائی کتب سے شروع ہوکر درسِ نظامی کی آخری بڑی کتاب صحیح بخاری شریف تک ہر اہم کتاب آپ کے زیرِدرس رہی۔ ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء میں جامعہ کے ناظم تعلیمات اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید مصباح اللہ شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال پُر ملال کے بعد بخاری شریف کے دونوں حصے آپ ہی کے زیرِدرس رہے، رفیق دارالتصنیف کی حیثیت سے حضرت الاستاذ نے اپنے شیخ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے کئی علمی وتحقیقی خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کا اعزاز پایا، جن میں ''**كشف النقاب عما يقوله الترمذي: وفي الباب** '' سرفہرست ہے، جس کی پانچ جلدیں طبع ہوچکی ہیں، اس کے علاوہ پچاس سے زائد چھوٹی بڑی کتب اور تراجم اپنے علمی ورثہ میں چھوڑیں اور یوں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے دارالتصنیف کی رفاقت کے لیے انتخاب کو درست ثابت کر دکھایا۔

۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کی تحریری وصیت کے مطابق ان کی زندگی کے جانشین حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن نور اللہ مرقدہٗ کو جب جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے مسندِ اہتمام کی ذمہ داری سونپی گئی تو اہتمام کی نیابت کے لیے حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب باصواب عمل میں آیا اور آپ نائب مہتمم کی حیثیت سے کاروانِ بنوریؒ کے

حدی خواں بن گئے، مگر نیابت کی ذمہ داری ایسی سلیقہ مندی اور شائستگی سے نبھائی کہ انتظامی مشاغل کو اپنے علمی وتحقیقی مشاغل پر حاوی نہیں ہونے دیا، آپ کی نیابت کی نشست وہی رہی جو آپ کی تحقیق وتصنیف کی نشست تھی، چنانچہ اہتمام کی نیابت کے عرصہ میں آپ کا مشغلہ درس اور تصنیف سے ایسا جڑا رہا کہ آپ کی انتظامی ذمہ داری سے پہلے اور بعد کی زندگی میں کسی نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔

۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء میں جب جامعہ کے مہتمم ثانی حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمہ اللہ کی رحلت فاجعہ کا سانحہ پیش آیا تو جامعہ کی مجلس منتظمہ نے حسب دستور تین روزہ مسنون سوگ کے بعد باہمی اتفاق رائے سے حضرت مولانا حبیب اللہ مختار رحمہ اللہ کو جامعہ کے اہتمام کی ذمہ داری سونپی اور حضرت بنوری رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند مولانا سید محمد بنوری رحمہ اللہ کو نائب مہتمم مقرر کیا گیا، اس موقع پر جامعہ کے منصب اہتمام کے ساتھ ساتھ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نظامت علیا کا منصب بھی خالی ہوا تھا، اس منصب کی ذمہ داری اُٹھانے کے لیے بھی مولانا حبیب اللہ رحمہ اللہ ہی کا انتخاب عمل میں آیا، چنانچہ آپ پر بیک وقت جامعہ کے مہتمم اور وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں عائد ہوگئیں۔

بعض لوگ حیران تھے کہ ایک گوشہ نشین محض علمی وتحقیقی ذوق کی حامل شخصیت اتنی بڑی انتظامی ذمہ داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہوسکتی ہے؟! مگر وقت نے آپ کے انتخاب کو ایسا درست ثابت کیا کہ آپ کے حسن انتظام کی مثالیں دی جانے لگیں۔ جامعہ میں آپ کا معمول یہ رہا کہ صبح آٹھ بجے درس گاہ تشریف لاتے، شروع شروع میں ایک، پھر مسلسل دو گھنٹے درس دینے کے بعد دفتر میں بیٹھتے اور ظہر کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لے جاتے، ظہر تا عصر گھر میں آرام کی ترتیب رہتی، اور عصر کی نماز کے لیے تشریف لاتے تو پھر رات کو دیر تک دفتر میں موجود رہتے تھے، اس دوران دفتری امور کے علاوہ اپنے تصنیفی وتحقیقی کام بھی سرانجام دیتے، یہ آپ کی زندگی بھر کا معمول رہا۔

دوسری طرف وفاق المدارس العربیہ کی نظامتِ علیا کی ذمہ داریوں کے علاوہ پورے ملک کے مدارس سے تعلق وربط بھی بے مثال رہا، کبھی بلا اطلاع دور دراز علاقوں میں پہنچ جاتے، کبھی وفاق کے امتحانی نظم کے عنوان سے کراچی سے لے کر سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کے دور دراز کے امتحانی مراکز کا ایک ہی ہفتہ میں معائنہ فرمالیا کرتے تھے، یہ مختصر وقت کا ہنگامی سفر کتنا مشکل یا کتنا آسان ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس وقت ان کے ہم سفر ہوا کرتے تھے، آپ کی یہ انتظامی فعالیت اپنی مثال آپ ہی ہے۔

بہرکیف! حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ کی ہمہ جہت شخصیت پر کئی پہلوؤں

سے پی. ایچ. ڈی کی گنجائش بلکہ ضرورت ہے، میری معلومات کے مطابق بعض جامعات میں آپ کی شخصیت کے علمی و تحقیقی پہلو سے کام بھی ہو رہا ہے۔

مجھے میرا یہ فراموش کردہ سبق ہماری جامعہ کے ایک باتوفیق، علم دوست فاضل، عزیز القدر مولانا سید زین العابدین صاحب حفظہٗ اللہ نے یاد دلایا، جو حضرت الشیخ کی حیات وسوانح پر کام کا ارادہ رکھتے ہیں، انہوں نے مجھے بھی احساس دلایا کہ دیگر بعض اساتذۂ کرام کی طرح اپنے استاذِ گرامی حضرت شیخ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی کچھ ٹوٹے پھوٹے کلمات یکجا کر دوں، چنانچہ برادرم زین العابدین کی تحریک وتحریض کی بدولت میں اس سعادت سے جیسے تیسے سہی ہمکنار ہو رہا ہوں، ورنہ بار بار ارادہ کے باوجود یہ موقع نہیں مل پایا تھا، جس کا ایک اولین سبب یہ بھی رہا کہ ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء میں جب آپ کی شہادت ہوئی تو اس وقت ہم تخصص فی الفقہ سال اول کے طالب علم تھے، تخصص کا اگلا سال بھی یوں ہی طالب علمانہ مشاغل میں رہا اور تقرر کے اوائل میں یہ شعور ناپختگی کا شکار رہا، پھر جب خیال آیا تو ہر نیا حادثہ پرانے حادثے کا تسلسل بنتا چلا گیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الشیخ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دنیا و آخرت کے ہم سفر حضرت الاستاذ مولانا مفتی عبدالسمیع شہید رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر جامعہ کے تاحال آخری شہید برادرِ گرامی مولانا قاری افتخار احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ تک تمام شہداء بنوری ٹاؤن کے خون کی برکت سے جامعہ کو تاقیامت قائم ودائم رکھے، اس کے فیض کو جاری وساری فرمائے، مزید حادثات سے محفوظ ومامون فرمائے اور ہمیں اپنے اکابرومشائخ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

أللّٰہم اغفر موتٰنا وموتٰی المسلمین ، أللّٰہم اغفر لہم وارحمہم ، وارفع درجاتہم وأکرم نزلہم ، واجعلہم من ورثۃ جنّٰت النعیم ، آمین

حلال فوڈ!

امکانات وخدشات

مفتی شعیب عالم

حلال فوڈ کی وسعت

1:.....فوڈ کے لفظ سے دھیان کھانے پینے کی اشیاء کی طرف جاتا ہے، مگر یہ اس کا محدود تصور ہے، آج کل حلال فوڈ کی اصطلاح ایک وسیع تناظر میں استعمال ہوتی ہے اور اس سے مراد صرف بیف، چکن، مٹن، اور ڈیری اور بیکری کے آئٹم نہیں ہوتے، بلکہ فوڈ، بیوریج، میڈیسن، کاسمیٹکس یعنی ماکولات ومشروبات سمیت ادویات، خدمات، آرائش وزیبائش کے آلات اور ٹیکسٹائل مصنوعات سب ہی مراد ہوتے ہیں۔ مستقبل قریب میں اس اصطلاح کے اندر اور زیادہ عموم اور وسعت آئے گی اور اگلے کچھ عرصے میں مصنوعات کی فنانسنگ، سورسنگ، پروسیسنگ، اسٹوریج اور مارکیٹنگ وغیرہ سب حلال فوڈ کے دائرے میں آجائیں گے۔ ممکن ہے کہ جس طرح زرعی لائیو اسٹاک کے سپلائی چین کے تمام اسٹیک ہولڈرز، مثلاً کاشتکاروں، سپلائرز، نقل وحمل کی کمپنیوں اور تاجروں وصنعت کاروں کو ایک سطح پر لایا جارہا ہے، اسی طرح حلال فوڈ کے سلسلے میں خام مال سے لے کر صارف تک اور کھیت سے کانٹے تک حلال کا ایک مربوط نظام تشکیل دے دیا جائے اور نہ صرف یہ کہ مصنوعات کا مواد اور تیاری اور پیکنگ اور لیبلنگ اور نقل وحمل وغیرہ حلال طریقے سے ہو، بلکہ ان تمام مراحل میں جن عوامل کی بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت ہو اور جو سرمایہ اس میں استعمال ہو وہ بھی حلال ہو۔

2:.....فوڈ کا یہ مستقبل افلاطون کی آسمانی ریاست کی طرح کچھ تصوراتی اور نظریاتی سا محسوس ہوتا ہے، لیکن حلال کی بڑھتی ہوئی مانگ اس خاکے میں رنگ بھر رہی ہے اور ریاستوں کے معاشی مفادات اس میں روح پھونک دیں گے۔ معاشی اعداد وشمار اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ حلال فوڈ کا دائرہ بڑھ اور پھیل رہا ہے۔ اس کی واضح دلیل ورلڈ حلال فورم کی کچھ عرصہ قبل کی یہ جائزہ رپورٹ ہے کہ حلال فوڈ کی تجارت کا حجم اس وقت چھ سو پچاس ارب ڈالر سالانہ ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

3:.....حلال کے اس بڑھتے ہوئے بزنس اور روز افزوں ترقی کرتی ہوئی مارکیٹ کی وجہ سے اب کسی مسلمان ملک کے لیے اس میدان میں پیچھے رہنا کئی حوالوں سے نقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔ بڑا نقصان تو ریاست کے نقطۂ نظر سے معاشی ہے، کیونکہ معاشی فائدہ اس وقت ایک ایسا دیوتا ہے جو ہر جگہ پوجا جاتا ہے اور فرد ہو یا مملکت ہر ایک اس کے سامنے گھٹنوں کے بل گرا نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی کل تعداد کا ستر فیصد حلال کو پسند کرتا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیرمسلم صارفین بھی حلال پر اعتماد کرتے ہیں۔ حلال کا ٹریڈ مارک ایک مقبول و مرغوب علامت اور صحت وصفائی کی ضمانت بن گیا ہے اور جو مصنوعات اس علامت سے خالی ہوں وہ صارفین کے ایک بڑے طبقے سے محروم رہتی ہیں۔ جو مال حلال سرٹیفائڈ نہ ہو وہ اگر بیرونِ ملک برآمد کیا جائے تو وہاں پورٹ پر پڑا رہتا ہے اور وہاں کے حکام برآمد کنندگان سے حلال تصدیق نامہ طلب کرتے ہیں۔ اگر بیرونِ ملک حلال تصدیق نامہ حاصل کیا جائے تو علاوہ دوسری مشکلات کے مال کی لاگت میں کافی اضافہ ہوجاتا ہے۔

4:..... یہ سن کر کہ حلال کی بین الاقوامی مارکیٹ کا حجم تین ٹریلین ڈالر تک جا پہنچا ہے، خوشی محسوس ہوتی ہے، مگر یہ جان کر طبیعت افسردہ ہوجاتی ہے کہ جس طرح بین الاقوامی سیاست میں مسلمانوں کا وزن نہ ہونے کے برابر ہے، اسی طرح حلال کی تجارت میں بھی مسلمان ملکوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف خلیجی ممالک چوالیس ارب ڈالر حلال کی درآمد پر پھونک رہے ہیں۔ انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے، مگر اُسے گوشت کی سپلائی کرنے والا سب سے بڑا ملک برازیل ہے، حالانکہ حلال ہمارا لوگو اور ہم اس کے علمبردار، اولین داعی اور دنیا کو اس سے روشناس کرانے والے ہیں۔ دوسری طرف غیرمسلم نہ صرف اس میدان میں دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ ان کا مقصد ہی اس اسکیم کو اپنے کنٹرول میں رکھنا ہے۔ اگر وہ لوگوں کا رجحان دیکھ کر اور اپنے معاشی فوائد کے پیشِ نظر لوگوں کو اسلامی بینکاری کی سہولت دے سکتے ہیں تو حلال فوڈ کے انتظام میں ان کو کیا رکاوٹ ہے!؟۔ ان کی حالیہ کوشش یہ ہے کہ خود ہی اپنے ممالک میں حلال وحرام کے معیارات وضع کریں اور خود ہی اس کے مطابق سرٹیفکیشن اور ریگولیشن کا انتظام کریں۔ جب وہ خود ہی قواعد وضع کرکے ادارے قائم کرلیں گے تو مسلمانوں کے حلال تصدیقی ادارے خود ہی ان کے ممالک سے باہر ہوجائیں گے۔ اگر معاملہ صرف اس حد تک محدود ہوتا کہ وہ اپنے ممالک میں حلال تصدیقی ادارے قائم کریں گے تو مذہبی نقطہ نظر سے کوئی اشکال کی بات نہ تھی، کیونکہ اپنے قوانین میں وہ آزاد ہیں اور مسلمانوں کو ان پر عمل داری حاصل نہیں، مگر قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ مسلمان ملک پاکستان نے بھی انہیں حلال سرٹیفکیشن کی اجازت دے دی ہے۔ پچھلے کالم میں اس کے مضمرات پر بالتفصیل بحث ہوچکی ہے۔

5:.....جو امر خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری خوابیدہ مملکت اب جاگ اٹھی ہے

اور ایک بھرپور انگڑائی لے کر وہ دھاڑی بھی ہے جس سے اس کے وجود کا احساس ہو چکا ہے۔ قومی اداروں کو متحرک کیا جارہا ہے، متعلقہ محکمے قانون سازی کررہے ہیں، آئے دن ورکشاپ اور سیمینار منعقد ہورہے ہیں، اخبارات خبریں چھاپ رہے ہیں اور صحافی کالم لکھ رہے ہیں۔ وزرا اعلانات کررہے ہیں کہ مصنوعات کو حلال سرٹیفائڈ کرنے پر معقول سبسڈی دی جائے گی۔ ایک وزیر موصوف تو سبقت لسانی سے پچاس فیصد سبسڈی دینے کا وعدہ بھی کر بیٹھے تھے۔ وزرا کے ان اعلانات، حکومتی اقدامات اور حلال کے متعلق قانون سازی وغیرہ سے حلال فوڈ کے میدان میں حکومت کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے، بلکہ دعویٰ تو پاکستان کو حلال کچن اور حلال کے لیے رول ماڈل بنانے کا ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ حلال فوڈ کا یہ غلغلہ بھی سب سے پہلے پاکستان، ایشین ٹائیگر، سرسبز پاکستان اور قرض اتارو ملک سنوارو کے نعروں کی طرح محض وعدہ، خالی نعرہ، سیاسی شوشہ اور سبز باغ نہ ہو جو لوگوں کو دکھایا جارہا ہو۔

6:..... بظاہر حکومت سنجیدہ ہے اور خدشہ بے بنیاد ہے۔ حکومت اگر حلال تجارت میں زیادہ سے زیادہ حصے کی خواہاں ہے تو کوئی قابل اعتراض فعل نہیں، بلکہ اس ضمن میں مقدور بھر کوشش اس پر لازم ہے۔ دینی نقطہ نظر سے جب ہم کہتے ہیں کہ حلال کی ترویج اور حرام کا سد باب ہر ایک کی ذمہ داری ہے تو پھر حکومت کا عمل قابل اعتراض کیسے ہوسکتا ہے؟! اگر غذائی مصنوعات کے علاوہ بھی حلال فوڈ کا دائرہ پھیلتا ہے تو اسلام کے تصورِ حلال وحرام کے عین مطابق ہے، کیونکہ حلال وحرام کا تعلق صرف کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے سے نہیں، بلکہ یہ ایک قدر اور معیار کا نام ہے اور عالمگیر پیغام ہے جو ہر شعبہ میں اپنا احیاء چاہتا ہے۔ اسلام اگر زمان ومکان کی قید سے بے نیاز اور رنگ ونسل کی تحدید سے بالاتر ہے تو اس کا تصورِ حلال وحرام صرف صارف یا صانع تک یا محض کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے تک یا کسی خاص شعبہ تک کیسے محدود ہوسکتا ہے؟!

7:...... بہرحال جو اندیشہ ہے وہ یہ نہیں کہ حکومت سنجیدہ ہے یا نہیں، بلکہ اصل اندیشہ یہ ہے کہ حلال کا معاملہ نازک اور حساس ہے۔ دوسری طرف یہ بات کہ حکومت جس چیز میں پڑی ہے وہ کب سلامت رہی ہے۔ زکوۃ اور عشر کا نظام، معیشت کی اسلامائزیشن کا معاملہ اور اسلامی بینکاری کا قصہ وغیرہ ایسے معاملات ہیں جن سے اس خدشے کو تقویت ملتی ہے کہ حکومت کی مداخلت سے اس اسکیم کا رخ کسی اور طرف نہ ہوجائے۔

8:..... ایک اور اندیشہ یہ ہے کہ حلال ٹریڈ میں اضافہ اسی وقت ممکن ہے جب ہماری مصنوعات حلال معیار کے مطابق ہوں اور اس کے ساتھ ہم ورلڈ حلال سرٹیفیکیشن کا حصہ بن جائیں اور اپنی مصنوعات کو بین الاقوامی حلال معیارات سے ہم آہنگ کرلیں۔ لیکن بین الاقوامی معیارات کو اگر بصیرت اور حکمت عملی کے ساتھ نافذ کرنے کے بجائے اندھا دھند نافذ کیا گیا تو اس کے نتیجے میں مقامی

تجارت دب کر اور ملکی مصنوعات کھوٹی ہو کر رہ جائیں گی اور بین الاقوامی معیارات کو نافذ کرنے کا مطلب یہ نکلے گا کہ ملکی مصنوعات کی برآمد ممنوع اور باہر کی مصنوعات درآمد کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معیارات میں حفظانِ صحت اور کوالٹی کنٹرول کے اصول بھی لازمی شرائط کا درجہ رکھتے ہیں، جب کہ ہمارے ہاں کی صورتحال سے ہر پاکستانی بخوبی واقف ہے۔ اگر عملی مشاہدہ درکار ہو تو کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا وزٹ کیجیے، وہاں کے پروڈکشن ایریا میں جو صفائی وستھرائی اور چمک دمک نظر آئے گی اور پروڈکٹ کے مناسب جو درجہ حرارت اور ماحول وہاں قائم ہوگا، ملکی کمپنیوں کے لیب میں بھی اس درجہ کا معیار نظر نہیں آئے گا، ایسے واضح فرق کے ساتھ عالمی معیار یہاں نافذ کردیے گئے تو نتیجہ اپنی مصنوعات کی کھپت روکنے کے سوا اور کیا ظاہر ہوگا؟!۔

9:.....مقصد یہ بھی نہیں کہ کوالٹی کنٹرول اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی سرے سے ضرورت ہی نہیں اور ہمارے تاجر اور صنعت کار غذا کے نام پر لوگوں کو زہر کھلاتے رہیں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ مقامی تجارت کو تدریجاً اس سطح پر لایا جائے، کیونکہ ایک تو محض قانون کے زور پر تبدیلی مشکل ہوتی ہے۔ دوسرے قانون سے پہلے اس کے لیے سازگار ماحول اور مناسب فضا درکار ہوتی ہے، ورنہ نتیجہ قانون کی ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ تیسرے ایسے قوانین سے معاشرے میں ہلچل اور اضطراب ضرور پیدا ہوتا ہے، مگر عملی افادیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

10:.....ان بین الاقوامی معیارات کو روبہ عمل لانے سے پہلے یہ اطمینان بھی ضروری ہوگا کہ کہیں حلال کے اسلامی معیارات ان بین الاقوامی معیارات میں گم ہوکر رہ نہ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا کے سامنے حلال کا صاف اور واضح تصور نہ آسکے گا اور اس کی وجہ سے حلال فوڈ کے پیچھے جو دینی اور دعوتی مقاصد ہیں وہ حاصل نہ ہوسکیں گے، کیونکہ حلال فوڈ سے مقصود صرف تجارت نہیں بلکہ دنیا کو اسلام کے آسان، سادہ اور فطرت کے عین مطابق اصولوں سے واقف کرانا بھی ہے اور انہیں عملی طور پر یہ باور کرانا ہے کہ اسلامی اصول، روح اور اخلاق کے ساتھ ان کی صحت وزندگی کے بھی ضامن ہیں۔ ممکن ہے کہ جو لوگ ہر معاملہ کو معاشی مفادات کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ اس جیسے کسی مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھیں، مگر اس سوچ کو نظر انداز کرنے کا نقصان یہ ہوگا کہ حلال کی اسکیم عوامی حمایت اور زیادہ صاف لفظوں میں مذہبی حمایت سے محروم ہو جائے گی اور اگر عام مذہبی طبقہ کی اس طرف توجہ نہ ہو یا وہ بھی اسے اہمیت نہ دیں تو اہل علم کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں آواز اٹھائیں، کیونکہ وہ نگران ونگہبان ہیں اور دین حنیف کے مزاج اور خصوصیت کی حفاظت ان کی ذمہ داری ہے۔

11:.....ورلڈ حلال سرٹیفکیشن کا حصہ بننے سے قبل کچھ اور امور بھی ہیں جو فوری توجہ چاہتے ہیں اور جو ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔

خوراک ہر جاندار کی بنیادی ضرورت ہے۔ مناسب، متوازن، صحت بخش اور معیاری خوراک صحت مند نشو ونما اور بیماریوں سے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے، جب کہ ناقص، غیر متوازن اور غذائیت سے عاری خوراک سے انسان مختلف قسم کی بیماریوں، ذہنی وجسمانی معذوریوں اور ناامیدی و مایوسیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات کی رو سے بھی ایک فعال اور صحت مند زندگی گزارنے کے لیے ہمہ وقت درکار مناسب خوراک تک تمام افراد کی رسائی ضروری ہے۔ آئین پاکستان کی دفعہ ڈی ریاست کے ہر شہری کو خوراک سمیت زندگی کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنانے کا تقاضا کرتی ہے۔

بہرحال بین الاقوامی معاہدات، ریاستی قوانین اور دینی تعلیمات کی روشنی میں رعایا کو صاف اور متوازن خوراک کی فراہمی وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ لوگ معیاری اور مناسب خوراک جیسی بنیادی ضرورت سے محروم ہیں۔ جو قوانین ملکی سطح پر رائج ہیں ان پر عمل درآمد کا یہ حال ہے کہ ملک میں بھیڑ بکری کے گوشت کے بجائے کتوں اور گدھوں کا گوشت بھی فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ایسے واقعات اگرچہ کم ہیں، مگر سسٹم کی خرابی اور متعلقہ محکموں کی غفلت کا ثبوت ضرور ہیں۔ دوا کے نام پر تو زہر کی فروخت عام ہے، یہاں تک کہ جان بچانے والی ادویات میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے، حالانکہ ڈرگ ایکٹ مجریہ ۱۹۷۶ء کے تحت جعلی اور زائد المیعاد اور غیر معیاری ادویات کی خرید وفروخت ممنوع ہے اور ایسی دواساز کمپنیوں، ڈرگ اسٹورز اور ڈسٹری بیوٹرز کے خلاف سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔

۲۰۰۲ء میں ترمیم کے ذریعے اس قانون کو مزید سخت کر دیا گیا ہے اور ڈرگ انسپکٹر کو ایسی کمپنی، کارپوریشن، فرم اور اس کے ڈائریکٹرز اور ملازمین کے خلاف کارروائی کا اختیار دیا گیا ہے۔ ۱۹۷۶ء کے مذکورہ ایکٹ کے بعد کوئی بھی شخص کسی بھی طریقے سے کوئی جعلی ''Spurious'' نقلی ''Counterfeit'' غلط نشان زدہ ''Misbranded'' ملاوٹ والی ''Adulterated'' غیر معیاری ''Substandard'' اور ایکسپائری ''Expiry'' دوا فروخت نہیں کر سکے گا۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ملاوٹ کی لعنت، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور یونانی طب سب کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے، حالانکہ ادویات میں ملاوٹ ایسا گھناؤنا فعل ہے جو بسا اوقات انسانی جان بھی لے لیتا ہے۔

12:.....۱۹۸۳ء میں دنیا میں پہلی بار صارفین کے حقوق کا عالمی دن منایا گیا جس کے بعد یہ معاملہ اہمیت اختیار کر گیا اور اب ہر سال ۱۵؍ مارچ کو دنیا بھر میں یہ دن منایا جاتا ہے۔ اس دن صارفین کی تنظیمیں جاگ جاتی ہیں، سیمینار اور ورک شاپ منعقد ہوتے ہیں، بینرز، پوسٹرز اور واک کر کے اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے صارفین کے حقوق کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ صارفین کے حقوق سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ پیداواری عمل سے لے کر تیاری تک کے تمام مراحل میں صارف کو تحفظ اور رہنمائی فراہم کی

جائے گی اور اس کے ساتھ یہ بات یقینی بنائی جائے گی کہ صارف کے طویل المدتی مفادات کا تحفظ ہو اور اس کو ملنے والی خدمات اور مصنوعات معیاری ہوں اور ان کے متعلق اسے درست معلومات فراہم کی جائیں گی اور اسے گمراہ کن تشہیر کی صورت میں دھوکہ دہی سے بچایا جائے گا، اس کے ساتھ پالیسیاں بناتے وقت صارفین کی تجاویز اور مطالبات کو مناسب جگہ دی جائے گی اور اس سے ہونے والے کسی نقصان کی مناسب تلافی کی جائے گی۔ ۹/ اپریل ۱۹۸۵ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے صارفین کے حقوق کو اپنی گائیڈ لائن کے طور پر شامل کیا۔ پاکستان بھی بین الاقوامی برادری کا رُکن ہونے کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی وضع کردہ گائیڈ لائن پر عمل کا پابند ہے۔ ملکی سطح پر صارفین کے حقوق کے متعلق قوانین موجود ہیں اور سندھ اسمبلی نے تو پچھلے سال کنزیومر پروٹیکشن ایکٹ کی صورت میں صارفین کے حقوق کا قانون بھی منظور کیا ہے اور شنید یہ تھی کہ قانون کے ساتھ صارفین کو فوری اور سستا انصاف فراہم کرنے کی غرض سے کنزیومر کورٹس بھی قائم کی جائیں گی، مگر اس کے باوجود ناقص، غیر معیاری اور مضر صحت اشیاء کی فروخت عام ہے۔ جانوروں کو گندے مذبح خانہ میں ذبح کر کے کھلے ٹرکوں اور آلودہ ماحول میں گوشت مارکیٹوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ انعامات کا لالچ دے کر اور جھوٹی اشتہار بازی کے ذریعے عوام کو گھٹیا اشیاء فراہم کر دی جاتی ہیں، مگر نہ حکومت کا کوئی وجود نظر آتا ہے اور نہ قانون کو حرکت ہوتی ہے۔

خلاصہ

1:.....حلال فوڈ ایک وسیع اصطلاح ہے اور اس کا دائرہ بڑھ اور پھیل رہا ہے۔ (پیرانمبر:1، 2)

2:.....ہماری حکومت بھی اس شعبہ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ (پیرانمبر:5)

3:.....شرعی حوالے سے حکومت پر اس ضمن میں مقدور بھر کوشش لازم ہے۔ (پیرانمبر:6)

4:.....کیونکہ اب اس میدان میں پیچھے رہنا کئی حوالوں سے نقصان دہ ہے۔ (پیرانمبر:3، 4)

5:.....مگر گورنمنٹ پر یہ احتیاط لازم ہے کہ اس اسکیم کا اسلامی تشخص برقرار رہے۔ (پیرانمبر:7)

6:.....حلال وحرام کے حوالے سے قانون سازی کے وقت حکمتِ عملی کے اصول طے کرنا ضروری ہیں۔ (پیرانمبر:8)

7:..... بین الاقوامی معیارات کے نفاذ سے قبل یہ اطمینان ضروری ہے کہ اسلامی اصول ان میں دب کر نہ رہ جائیں، کیونکہ حلال فوڈ کے پس پشت دینی ودعوتی مقاصد کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ مادی فوائد کی حیثیت ضمنی وثانوی ہے۔ (پیرانمبر:9، 10)

8:..... نئے قانون کے اجراء ونفاذ سے قبل پہلے سے موجود قوانین پر عمل درآمد کی ضرورت ہے، جن میں ملاوٹ وجعل سازی کی روک تھام، مناسب غذا کی فراہمی اور صارفین کے حقوق کے تحفظ کا قانون شامل ہو۔ (پیرانمبر:11، 12)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی وعرفانی مقام

(تیسری اور آخری قسط)

جناب محمد ظفر اقبال

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فیضانِ کرم سے کفار تک بہرہ ور تھے

مخلوق کی بلاتفریقِ مذہب وملت اور بلاتخصیصِ نسل ونسب محبت' اخلاقِ صوفیہ میں داخل ہے۔ اخلاقِ صوفیہ فی الاصل مشکوٰۃِ نبوت ہی سے ماخوذ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر باش رہنے والوں میں تربیت کے متعلق فرمایا گیا:

''أفضلهم عندهٗ أعمهم نصيحةً، وأعظمهم عندهٗ منزلةً أحسنهم مواساةً ومؤازرةً۔''(۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں افضل وہ مانا جاتا تھا جس کی خیرخواہی عام ہوا کرتی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مرتبے کے لحاظ سے سب سے عظیم اور بڑھا ہوا وہ ہوتا تھا جو ہم دردیِ خلق اور لوگوں کی ذمے داریوں کا بار برداشت کرنے میں سب سے بہتر ہوتا تھا۔''

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان ہی اوصاف سے موصوف تھے۔ ان کی آغوشِ شفقت مسلمان تو مسلمان' کفار تک کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ مولانا محمود رام پوری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ میں اور میرے ساتھ ایک ہندو ایک مقدمے کے سلسلے میں دیوبند آئے، دیوبند پہنچ کر اس ہندو نے مجھ سے پوچھا: تم کہاں ٹھہروگے؟ میں نے کہا: میں مولانا [محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ] کے یہاں قیام کروں گا۔ وہ ہندو بولا کہ جی میں روٹی تو اپنے اقارب میں کھالوں گا، باقی سونے کے واسطے اگر کوئی چھوٹی سی چارپائی مجھ کو مل جائے تو وہاں ہی ٹھہر جاؤں گا۔ میں نے کہا: مل جائے گی، تو روٹی کھا کر آجانا۔ ایسا ہی ہوا، میں نے حضرت مولانا [محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ] کی بیٹھک میں ایک چارپائی اس کے لیے الگ بچھادی۔ ایک چارپائی پر [میں] لیٹ گیا، وہ ہندو تو پڑتے ہی سوگیا اور میں جاگ رہا تھا کہ حضرت مولانا دبے پیروں زنانہ مکان سے تشریف لائے اور اس ہندو کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگے، میں ایک دم چارپائی سے کھڑا ہوگیا اور جا کر عرض کیا: حضرت! چھوڑ دیں، میں دبا دوں گا۔ فرمایا کہ: یہ تمہارا حق نہیں، میرا مہمان ہے، یہ خدمت میرے ذمے ہے۔ میں نے اصرار کیا، اس پر فرمایا کہ: جاؤ! تم کون ہوتے ہو؟ گڑبڑ مت کرو، بے چارے کی آنکھ کھل جائے گی۔ بس وہ ہندو تو پڑا ہوا خرخر کر

رہا تھا اور مزاحاً فرمایا کہ ان کا مقدر تھا اور مولانا پاؤں دبا رہے تھے۔‘‘(۲)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ان واقعات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقوق جو انسان پر قانوناً فرض نہیں ہیں، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اُنہیں باطن کے تصفیے اور روحِ تصوف کی تکمیل کے لیے خود پر اخلاقاً فرض کرلیا تھا۔ یہی عارفین سلف اور صوفیائے کاملین کا مابہ الامتیاز ہے جس کی عملی سیرت سنت کی اصطلاح میں ’’خُلُق‘‘ ہے۔

اشد ضرورت پر باطنی کمالات وتصرفات کا اظہار

ایسے عرفانی اوصاف اور احسانی کمالات کے حامل انسانوں کے قلب ولسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمہ وقت قبولیت ومقبولیت کا درجہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ حضرات ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات کو خالی نہیں لوٹاتے، وہ خود کو خواہ کتنے ہی پردوں میں چھپائیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے حسنات اور کمالات کو عالم پر آشکارا کرکے ہی رہتا ہے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی قبولیت ومقبولیت کے اسی مقام پر فائز تھے:

’’مولوی کفایت اللہ صاحب سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی۔ مولانا [محمود حسنؒ] جس زمانے میں مالٹا میں تھے، ان [مولوی کفایت اللہ] پر اثنائے ذکر وشغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوئی تھی، مگر نہ کرسکے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے، انہوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی۔ حضرت نے حسب عادت انکسار کا جواب لکھا جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ ’’حیرانم کہ بچہ دہقان را بچہ کار سپرانند‘‘ مجھے ایسے کام کے لیے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ...... [آخر وہ حضرت (محمود حسنؒ) سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے] حضرت نے محبت سے پاس بٹھایا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ: تم نے کیا لکھا تھا؟ مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھتے ہو! بھلا میں اس کا اہل کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ: حضرت! اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض ہے کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا؟ آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، چوں کہ میں نے اسی دروازے پر تربیت پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے، اس لیے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں۔ اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ: اب کیا حالت ہے؟ عرض کیا کہ: کچھ نہیں۔ بعد عشاء بہ کمالِ شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرماکر ارشاد فرمایا کہ: حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو

میں نے بتایا ہے، یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں، چھوڑا اس ذکر وشغل کو جس میں جان سے عاجز ہوگیا اور حضرت اصرار فرماویں کہ گھبراؤ مت، ذکر وشغل جاری رکھو، اور کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کہ: کتب خانے کے سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جائے اور پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرے سے باہر مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ: اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے، پھر مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا تھا جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اس کو اپنے دست مبارک سے صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعد اشراق حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور درس کے لیے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا۔ سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لیے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی، لہٰذا میں نے اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے، پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آ گیا۔ حضرت نے ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کیے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتابوں میں تلاش مت کرنا، یہ جواب کتابی نہیں۔ بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے کہ یہاں ایک دوسرا اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال مع جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال جاتا رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا، فرمایا کہ اچھا جاؤ، مگر واپسی میں کم از کم یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے۔ چناں چہ واپسی بجائے ایک دن کے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حضرت کے حجرے کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون وقوت اور راحت معلوم ہوتی۔ غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا، اللہ جزائے خیر دے حضرت کو، میری ایسی دست گیری فرمائی کہ جس کا شکریہ تمام عمر ادا نہیں ہوسکتا۔‘‘ (۳)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت: باب ایمان میں شکوک کا یقین واطمینان میں تبدل

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں خود اپنی آپ بیتی

کے تحت ایک لرزا دینے والا عبرت آموز واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دورۂ حدیث کے سال میں نہ جانے کیوں مولانا گیلانیؒ ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے متعلق نعوذ باللہ! بہت سے شبہات اور بدگمانیوں میں مبتلا ہوگئے تھے ۔ یہ شبہات اور بدگمانیاں مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق دن بہ دن بڑھ رہی تھیں: ''گویا بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے عموماً ترمذی شریف کا درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار، سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، ہر حدیث میرے لیے بدگمانی اور سوئے ظن کا چقماق گویا بنتی چلی گئی ۔ دماغ صرف ہرزہ اندیشوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا ۔'' الغرض مولانا گیلانیؒ کی ایمانی کیفیت دن بہ دن ایسے روبہ زوال تھی کہ ''محسوس ہورہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں، العیاذ باللہ! پھسل رہا ہے'' کہ اچانک قدرت نے دست گیری فرمائی ۔ مولانا گیلانی، دیوبند کے امی رکن حضرت امیر شاہ صاحب مینڈھوؒ کی معرفت اپنے درد کے مداوا اور ایمان کی سلامتی کی غرض سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، حضرت امیر شاہؒ نے تعارف کراتے ہوئے کہا: آپ کے شاگرد ہیں، کچھ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں ۔ مولانا گیلانیؒ نے خلوت میں اپنے دل کا دکھڑا نہایت ہی رقت آمیز اور دردانگیز کیفیت سے بیان کیا، یہ سن کر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''مولوی صاحب! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے، تو یہ بے ایمانی کی نہیں ایمان کی دلیل ہے، ایمان نہ ہوتا تو ان حالات میں اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے؟ ۔''

مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''بعد کو یہ مضمون خود نبوت کے ارشادات میں بھی ملا، لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں، طمانیت اور بشاشت کی لہریں میرے چہرے پر کھلنے لگیں ۔ یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا: ''آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟'' اپنی تعلیمی روداد سنائی گئی، زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا ہے ۔ یہ معلوم کرکے فرمانے لگے: ''جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں، اب وہ سب کچھ باہر نکل رہا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے ۔'' شاید بے اختیار گریے کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ حضرت! میرے لیے خواہ کچھ بھی ہو، اب یہ حالت ناقابل برداشت ہے ۔ میرے لیے اس قسم کے وساوس واوہام کسی حیثیت سے بھی ہوں ناقابل تحمل ہیں، میری زندگی خطرے میں ہے، اب خواہ دنیا مانے یا نہ مانے، لیکن اپنے ذاتی تجربے کا میں کیا کروں؟ جواب میں فرمایا گیا: ''مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا ۔'' یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے ۔ آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی ۔ خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی زندہ

شہادت ہے کہ اس طویل عرصے میں، بحمد اللہ! پھر کسی قرآنی آیت، یا کسی نص نبوی میں کسی قسم کا شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا..... گویا کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہے۔''(۴)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی پشتی بانی: اَخلاف کے لیے ایقان کا مینارۂ نور

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا بے نظیر حافظہ واستحضار، بے مثل علمی تبحر، رسوخِ کامل اور وسعت نظر اپنوں ہی نہیں پرایوں میں بھی مسلم ہے۔ شاہ صاحبؒ تو خیر آفتاب علم تھے، ان کے درس وتقریر سے ایسے باکمال افراد ہندوستان کے مطلع پر ضیاء بار ہوئے جن کی نظیر ممکن نہیں۔ غور فرمایا جائے کہ کیا حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ علم ومرتبہ اور طلبہ کے لیے درسی ایقان کا منبع ہونا صرف حضرت شاہ صاحبؒ کی اکتسابی اور ذاتی باطنی کیفیت کا مظہر تھا یا اس کے پیچھے کسی ولیِ کامل کی پشتی بانی بھی کارفرما تھی؟ جس وقت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سفر پر روانہ ہونے لگے جس میں اسیر مالٹا ہوکر جانے کی نوبت آئی، اس وقت:

''علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ باوجود یہ کہ ترمذی کا سبق پڑھانے کے لیے آکر بیٹھ گئے تھے، عبارت بھی پڑھ دی گئی تھی۔ [مولانا انور شاہؒ نے] مفارقتِ حضرت [شیخ الہندؒ] کے غم میں کچھ نہ فرمایا، بلکہ ذرا دیر توقف فرما کر کتاب بند کردی اور حضرت [شیخ الہندؒ] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اس وقت چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت خاموشی سے جا کر بیٹھ گئے اور حضرت [شیخ الہندؒ] کی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تکلف سے کام نہ لیا، یوں ہی رہنے دیا، فرمایا!''شاہ صاحب! آپ کو میری موجودگی میں شبہات پیش آتے تھے، میں نہ رہوں گا تو شبہات پیش نہ آئیں گے، اور اگر آئیں بھی تو قدرت رہنمائی کرے گی۔ جاؤ! خدا کے سپرد! سبق پڑھاؤ''۔(۵)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس روحانی تصرف اور پشتی بانی سے مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو خود تو کیا شبہات پیدا ہوتے، وہ دوسروں کے لیے شبہات کے ازالے اور تصفیے کا تریاق بن گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درسی تقریر کے کمالات اور اثرات کے ذیل میں اپنے پہلے ہی دن کے تأثرات کو ایک جملے میں یوں سمو دیا ہے:

> ''[شاہ صاحبؒ کی تقریر کا] پہلا دن تھا، جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لیے قطعی ویقینی ہوگیا۔''(۶)

اس اطمینان وایقان کی گواہی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین، تلامذہ اور احباب سب ہی نے دی ہے۔

متذکرہ واقعات تو لوگوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف واپس لانے سے متعلق تھے۔ ایک واقعہ ایسا بھی ملاحظہ کیجیے جس میں ایک گستاخ کو اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے توبہ کی تلقین کی گئی تھی، لیکن اس نے اپنی گستاخی سے خود پر ہدایت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کرلیا اور ایمان سے محروم ہوگیا۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنبیہ: احمد احسن امروہوی کا انجام بد

مرحوم مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے عہد میں ردِّ تقلید اور حمایتِ اہل حدیث کی ایک ''پُر شور'' آواز تھے، انہوں نے برِ عظیم کے تمام اہل سنت و جماعت احناف کو ایسے دس مسائل کا انتخاب کر کے چیلنج دیا کہ اگر احناف اِن مسائل کے اثبات میں کوئی آیت، یا کوئی حدیث صحیح صریح قطعی الدلالۃ پیش کر دیں تو مولانا بٹالوی فی آیت اور فی حدیث ۱۰ر روپے انعام دیں گے۔ گویا مولانا بٹالوی کے زعم میں ان دس مسائل میں اہل سنت کے پاس کتاب و سنّت سے کوئی دلیل موجود نہیں تھی۔ اس چیلنج کے باعث ایک طرف جہاں علمائے احناف کی تحقیر و تذلیل ہوئی وہیں دوسری جانب امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تجہیل بھی لازم آئی۔ ظاہر ہے یہ تعلّی مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کو سخت ناگوار ہوئی، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت و اشارے سے اس اشتہار کا جواب ''ادلۂ کاملہ'' کے نام سے دیا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ منتظر رہے کہ مولانا بٹالوی اس کے جواب میں قلم اٹھائیں۔ مولانا بٹالوی نے تو اس کا جواب نہیں دیا، بالآخر جواب دہی کے لیے ایک ایسے صاحب کا انتخاب ہوا جو اپنی زبان کی تیزی اور قلم کی کاٹ میں طاق ہونے کے باعث حلقۂ اہل حدیث میں ''احسن المناظرین والمتکلمین'' کے لقب سے جانے جاتے تھے، ان کا نام محمد احسن امروہوی تھا۔ امروہوی موصوف نے ''ادلۂ کاملہ'' کا جواب ''مصباح الادلہ لدفع الادلۃ الذلہ'' کے نام سے لکھا۔ مولانا بٹالوی نے خود جواب لکھنے سے پہلو تہی فرماتے ہوئے امروہوی صاحب کی کتاب کو ''لاجواب اور جواب باصواب'' قرار دیا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعلان کے بعد ''مصباح الادلۃ'' کا جواب ''ایضاح الادلہ'' کے نام سے تحریر فرمایا جس میں جابہ جا محمد احسن امرہوی کی لسانی گستاخیوں اور قلمی بے احتیاطیوں پر تنبیہ فرمائی۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''[مصنف مصباح الادلہ] بعض مواقع میں اپنے جوش میں بے باکانہ کلماتِ تکفیر بول اُٹھے ہیں۔''(۷)

ایک مقام پر امروہوی صاحب کی گستاخیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مجتہد صاحب ماشاء اللہ مسلم ہیں، گو بدفہم اور متعصب و کج طبع اور ہر چند عباد صالحین و علمائے دین کی شان میں گستاخ اور مقلدِ طریقۂ رفاض ہیں اور اگرچہ تکفیر مومنین میں معتزلہ و خوارج کے شاگرد ہیں اور یہ امور گو یقیناً سخت خوف ناک ہیں اور سببِ خذلان و ہلاکت۔''(۸)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ الفاظ تحریر فرمائے ہوں گے، اس وقت ان کے حاشیۂ گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ کوئی پیشین گوئی فرما رہے ہیں۔ آپ کا مقصد امروہوی صاحب کو اکابر کی شان میں گستاخیوں پر تنبیہ اور اس کے خوف ناک انجام سے ڈرانا تھا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ امروہوی صاحب کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اشارہ کردہ جملے ''باعثِ خذلان و ہلاکت'' پورے ہوئے۔ امروہوی صاحب غیر مقلدیت

سے ترقی کر کے مرزا قادیانی کے حلقۂ ارتداد میں داخل ہوگئے۔ اندازہ کیجیے! وہ شخص جس کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی لائق تقلید نہیں تھی وہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے کاذب پر ایمان لاکر اس کی اقتدا کرنے لگا۔ مرتد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی بھی نمونۂ عبرت بن گئی، امروہوی صاحب مرزائیوں کی بھیک اور خیرات کے دست نگر ہوگئے۔ مرزا قادیانی کے مجموعہ اشتہارات نمبر: ۸۷ پر درج ہے:

''اس وقت ضروری طور پر اپنے دوستوں کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اخویم مکرم حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب جو اس وقت مقام بھوپال محلّہ چوبدار پورہ میں نوکری سے علیحدہ ہو کر خانہ نشین ہوگئے ہیں، بوجہ تکالیفِ عسر ہمدردی کے لائق ہیں.....لہٰذا ہر ایک بھائی کی اپنے اپنے مقدرت کے موافق توجہ درکار ہے۔'' (۹)

اس کے بعد مرزا قادیانی نے ان بائیس افراد کی فہرست دی ہے جنھوں نے مرتد احمد احسن امروہوی کو دو آنے سے پانچ روپے ماہوار خیرات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے دو آنے کا، دس آنے کا، چار آنے کا، دو نے آٹھ آنے کا، پانچ نے ایک روپے کا، تین نے دو روپے کا اور ایک نے پانچ روپے کا وعدہ کیا۔ یہ کل ۲۹ روپے دو آنے کی رقم ہوئی جس کا ۲۲ افراد نے وعدہ کیا۔ اور مرزا غلام قادیانی نے ''ھل من مزید'' کی غرض سے اشتہار جاری کیا۔ مرزا جو ''رئیس قادیان'' کہلاتا تھا خود اپنے پلّے سے سو پچاس روپے بہ آسانی بھجوا سکتا تھا، ورنہ اپنے دو تین مال دار مریدوں کو کہہ کر احمد احسن امروہوی کی کفالت کا ذمے دار ٹھہرا سکتا تھا، لیکن اتنی ارزاں اور حقیر سی بات کے لیے باقاعدہ اشتہار کے اجراء سے فی الاصل قدرت کو مرزا کی خست اور احمد احسن کی ذلت کا اشتہار دلوانا مقصود تھا۔ یہ تھا وہ انجامِ بد جس کی طرف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''باعث خذلان و ہلاکت''۔ بالفاظ دیگر ائمہ ہدیٰ کی شان میں گستاخیوں کا یہی وہ انجام تھا، جس کی طرف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ''سبب خذلان و ہلاکت'' کہہ کر تنبیہ فرمائی تھی۔

واقعات و نقول کی فہرست بہت طویل ہے، بہ طور خلاصہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے بڑا بنایا تھا۔ اگر ایک طرف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے محدث جلیل، تالیف و تصنیف کے پہلو سے ادیب اریب، سیاست و جہاد کے لحاظ سے مجاہدِ عظیم، اذکار و عبادات کے رخ سے صوفی باصفا نظر آتے تھے تو دوسری طرف بندگانِ خدا پر شفقت، بے نفسی و فنائیت، فروتنی و عاجزی، دنیا سے نہایت استغنا کے ساتھ ایک گونا تعلق، اکرام ضیف، اساتذہ و شیوخ ہی نہیں، ان کی اولاد، بلکہ اولاد کی اولاد کے ساتھ بھی اساتذہ کی نسبت سے احترام و تعلق کے معاملے، اور طالبان علوم پر شفقت و رافت ایسے عصر حاضر میں عنقا اوصاف و کمالات ہیں جس نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے عہد میں، ''عباد الرحمٰن'' کا مظہر کامل بنا دیا تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اس جامعیت و کاملیت کو آپ کے مقتدا

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے متعلق ایک ہی جملے میں سمو کر بیان کر دیا ہے:

''طریق سلوک میں اصل مقصود احسان ہے، سو بفضلہٖ تعالیٰ حاصل ہے۔''(۱۰)

احسان وعرفان کی یہی وہ کیفیت تھی کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے علم وعمل کا جامع بن کر تا زندگی انسانی حیات کے مختلف گوشوں کو معمور ومنور کیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دو بحورِ علم واحسان نے مل کر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو تیار کیا تھا۔ اور پھر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ''کارخانۂ علوم'' بن کر ہندوستان کو علم وفضل، وعظ وارشاد، افتا وتصنیف، دعوت وجہاد اور مناظرے ومکالمے کے لیے بے مثل اور لافانی رجال کارعطا کیے۔ آپؒ کی تربیت وتاثیر سے ہر فرد، فرقِ مراتب کے باوصف، اپنے وقت کا ''شیخ الہند'' بنا۔ بالفاظِ دیگر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ اور مسترشدین میں جس کو جس فن سے مناسبت اور اہلیت تھی ''نسبت محمودی'' اس کے ظرف کے مطابق اس میں ضرور منتقل ہوئی۔ یہ نسبت وتعلق ایسا ہی ہے جیسا سورج کا اس کی کرنوں سے ہوتا ہے۔ سورج کی ہر ہر کرن اپنی تابانی میں آفتاب ہی کا فیض ہوتی ہے۔ آفتاب ان تمام شعاعوں سے ماورا ہونے کے باوجود اپنی کرنوں سے مربوط اور متعلق بھی رہتا ہے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے چیدہ چیدہ اوصاف وکمالات کا فیض ان کے اخلاف وتلامذہ میں ان کے اپنے اپنے پیمانے اور ظرف کے مطابق منتقل ہوا، لیکن ان مختلف النوع اور متنوع بلکہ متضاد ومتبائن اوصاف کی جامع شخصیت ایک ہی رہی: شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ۔

در پسِ آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

''کارکنانِ قضا وقدر نے مجھے طوطی کی طرح آئینے کے پیچھے بٹھا رکھا ہے۔ جو کچھ بھی معلم ازل کہتا ہے میں وہی بولتا ہوں۔''

(انتہیٰ)

حوالہ جات

۱:......محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ، الشمائل المحمدیۃ، بیروت: دارالحدیث، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ:۱۶۲۔

۲:......اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، جلد:۲، صفحات:۲۰۶-۲۰۷، ملفوظ: ۲۸۵۔

۳:......محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، جلد:۲، صفحات:۱۰۰۶-۱۰۰۸۔

۴:......مناظر احسن گیلانیؒ، احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، کراچی: مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۱۱ء، صفحات: ۱۰۸-۱۱۲۔

۵:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد:۱، صفحات:۱۰۸-۱۰۹۔ ۶:......مناظر احسن گیلانیؒ، احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، صفحہ:۶۱۔

۷:......محمود حسنؒ، ایضاح الادلہ، دیوبند: مطبع قاسمی، [س-ن] صفحہ:۵۔ ۸:......ایضاً، صفحہ:۳۹۳۔

۹:......مرزا غلام احمد قادیانی، مجموعہ اشتہارات، ربوہ: الشرکۃ الاسلامیہ، [س-ن]، جلد:۱، صفحہ:۳۳۷۔

۱۰:......قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد:۷، صفحات:۴۲۹۔

(انتہیٰ)

محرم الحرام کا مہینہ!

شرعی حیثیت، احکامات

مفتی محمد راشد ڈَسکوی

نئے ہجری سال کی ابتدا

مدینہ منورہ کی طرف ہجرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے لے کر اب تک چودہ سو چھتیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے، چودہ سو سینتیسواں سال شروع ہو چکا ہے۔ محرم الحرام اسلامی تقویم ہجری کا پہلا مہینہ ہے، کتنے ہی پڑھے لکھے، دیندار لوگ ایسے ہیں جنہیں اسلامی تقویم کا علم ہی نہیں، ان سے اسلامی مہینوں کے نام معلوم کر لیں وہ آپ کو نہیں سنا سکیں گے، ان سے روزانہ کی اسلامی تاریخ معلوم کی جائے تو وہ نہیں بتلا پائیں گے۔ جب کہ اس کے برخلاف شمسی تقویم، اس کے مہینوں کے نام اور تاریخ ہر کسی کو معلوم ہوتی ہے۔ کسی بھی دن کسی سے بھی پوچھ لیں کہ آج کیا تاریخ ہے؟ تو فوراً بتا دیں گے۔ جب شمسی سال کے پہلے مہینے جنوری کی ابتدا ہوتی ہے تو ''نیوائیر نائٹ'' پر وہ خوشیاں بھی مناتے ہیں، خوب ہلّہ غلّہ کرتے ہیں، گویا اس طریقے سے وہ نئے سال کا آغاز کرتے ہیں۔ اس مقام پر ہم نے غور وفکر یہ کرنا ہے کہ ''نیوائیر'' کی اس طرز پر ابتدا ہم نے کہاں سے لی؟! ہمارے لیے تو ''نیوائیر'' کی ابتدا محرم الحرام کے بابرکت مہینہ سے شروع ہوتی ہے، اور چونکہ ہم مسلمان زندگی گزارنے کے طور طریقوں کے معاملے میں مستقل ایک کامل تہذیب کے مالک ہیں، اس لیے ہمیں اپنی زندگی کی راہ ورسم میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھکاری پن اختیار کرنا مسلمان کی مسلمانیت کے خلاف ہے، ہمیں کسی کے در پر جھکنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم تو خود ساری دنیا کو تہذیب وشائستگی کے آداب وطریقے سکھانے والے ہیں۔

نئے مہینے کے استقبال کا اسلامی طریقہ

''نئے سال'' کی ابتدا ہو یا ''نئے مہینے'' کی، شریعت میں جب بھی یہ (''نئے سال'' یا ''نئے مہینے'' کا) لفظ بولا جائے گا اس سے مراد اسلامی مہینہ ہی ہوگا، نہ کہ شمسی مہینہ۔ چنانچہ اس مہینے کی ابتدا کا

مسنون طریقہ شریعت کی طرف سے صرف یہ سامنے آتا ہے کہ مہینے کے اختتام پر نئے مہینے کے چاند کو دیکھنے کا اہتمام کیا جائے، یہ عمل مسنون ہے اور جب چاند نظر آجائے تو نیا چاند دیکھنے کی دعا بھی پڑھی جائے، یہ بھی مسنون ہے۔ اس مسنون طریقے کے ہی اپنانے میں اور دعاؤں کا اہتمام کرنے میں برکت، حفاظت اور ثواب ہے۔ ہمیں فضول قسم کی رسومات اور خرافات سے بچتے ہوئے اسی کا اہتمام کر کے سچے مسلمان اور محبّ النبی ﷺ ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔ امام ابن السنی رحمۃ اللہ علیہ نے مہینہ کی ابتدا کے بارے میں آپ ﷺ کی سنت وعادت شریفہ کا یوں ذکر فرمایا ہے:

''إن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان إذا رأی الهلالَ قال: ''اللّٰهم اجعله هلال یمنٍ و برکةٍ۔'' (عمل الیوم واللیلۃ لابن السنیؒ، ص: ۵۹۶، رقم الحدیث: ۶۴۱، مکتبۃ الشیخ، کراچی)

ترجمہ: ''حضرت رسول اللہ ﷺ جب پہلی رات کے چاند کو دیکھتے تو یوں دعا مانگتے: اے اللہ! ہمارے لیے اس چاند کو خیر و برکت والا بنادے۔''

ایک دوسری روایت میں اس وقت یہ دعا پڑھنے کا ذکر ہے:

''اَللّٰهم أَهِلَّهُ علینا بالیُمْنِ والإِیْمَانِ والسَّلامَةِ والإِسلامِ، ربِّیْ وربُّکَ اللّٰه''۔

(مسند أحمد بن حنبل، مسند أبی محمد طلحہ بن عبید اللہ، رقم الحدیث: ۱۳۹۷، ج: ۲، ص: ۱۷۹، دار الحدیث، القاھرۃ)

ترجمہ: ''اے اللہ! اس پہلی رات کے چاند کو امن وسلامتی اور ایمان واسلام کے ساتھ ہم پر طلوع فرما، (اے چاند!) میرا اور تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔''

ہمیں بھی مہینے کی ابتدا اُسی طرح کرنی چاہیے، جیسا کہ آپ ﷺ کا طریقہ تھا، تاکہ برکتیں اور رحمتیں حاصل ہوں، چہ جائیکہ! ہم رسوم و بدعات سے ابتدا کریں۔

اسلامی کیلنڈر استعمال کرنے کی اہمیت

دوسری بات یہ کہ ہمیں چاہیے ہم اسلامی تقویم ہجری کے استعمال کی عادت ڈالیں، اپنے روز مرہ کے استعمال میں اس تقویم کو سامنے رکھیں، اگرچہ! دوسری تقویمات، تاریخوں اور کیلنڈروں کا استعمال گناہ نہیں ہے، شرعاً اس کے اختیار کرنے میں بھی ممانعت نہیں ہے، لیکن شمسی تقویم کا ایسا استعمال کہ ہم اسلامی تقویم کو بالکلیہ بھلا ہی بیٹھیں، یہ کسی طرح درست نہیں، اس لیے کہ اسلامی تقویم ہجری کی حفاظت بھی مسلمانوں کا فرض ہے اور اس کے استعمال میں ثواب ہے جس سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ نیز! اپنی شناخت اور اپنے امتیاز کو باقی رکھنا بھی ایک غیرت مند مسلمان کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس معاملے میں اس کی بہتر شکل یہ ہے ہم قمری تاریخ کے استعمال کو ترجیحی بنیادوں پر دوسری تقویم کے مقابلے میں استعمال کریں، خدانخواستہ اگر سب مسلمان اسلامی تقویم ہجری کو چھوڑ بیٹھیں اور

بھلا دیں تو سب کے سب اللہ کے ہاں مجرم ٹھہریں گے، اس لیے کہ اسلام کی بہت ساری عبادات کا تعلق وربط اسی تقویم کے ساتھ ہے، حضرت حکیم الأمت رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں رقمطراز ہیں:

''...... البتہ چونکہ احکام شرعیہ کا مدار حسابِ قمری پر ہے، اس لیے اس کی حفاظت ''فرض علی الکفایہ'' ہے، پس اگر ساری امت دوسری اصطلاح کو اپنا معمول بنالیوے، جس سے حسابِ قمری ضائع ہوجاوے (تو) سب گنہگار ہوں گے اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی مباح ہے، لیکن خلافِ سنتِ سلف ضرور ہے اور حسابِ قمری کا برتنا بوجہ اُس کے فرض کفایہ ہونے کے لابُدّ افضل واحسن ہے۔'' (بیان القرآن، سورۃ التوبہ: ۳۶، ج:۳،ص:۱۳۱، مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

اسلامی سال کے اس پہلے مہینے کی اللہ کے ہاں بڑی قدر ہے، یہ عظمت والے مہینوں میں سے ہے، تاریخی روایات کے مطابق اس مہینے میں بہت سے عظیم الشان واقعات پیش آئے، احکامات کے اعتبار سے صحیح اور مستند احادیث سے جو امور سامنے آتے ہیں، وہ صرف دو ہیں:

ماہِ محرم الحرام میں پہلا حکم

اس ماہِ مبارک میں مطلقاً کسی بھی دن روزہ رکھنا رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ شمار ہوتا ہے، نیز! نو اور دس محرم یا دس اور گیارہ محرم کا روزہ رکھنا اور بھی زیادہ فضیلت کی چیز ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے:

''أفضل الصّيام بعد رمضان شهر الله المحرم، وأفضل الصّلاة بعد الفريضة صلٰوة الليل''۔ (صحیح مسلم، کتاب الصوم، باب فضل صوم المحرم، رقم الحدیث: ۲۰۲)

ترجمہ: ''رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل اللہ کے مہینہ محرم کے روزے ہیں، اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل رات کی نماز (تہجد) ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''حين صام رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يوم عاشوراء وأمر بصيامه، قالوا: يا رسول اللّٰه! إنه يوم تُعظّمه اليهود والنصارى؟ فقال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم: ''فإذا كان العام المقبل إن شاء الله صُمنا اليوم التاسع، قال: فلم يأت العام المقبل حتى توفى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم''۔

(صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب: أیّ یوم یصام فی عاشوراء؟ رقم الحدیث: ۱۱۳۴، ج:۲،ص: ۷۹۷، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورا کے دن خود روزہ رکھا اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا، تو اِس پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! اس دن کی تو یہود ونصاریٰ بھی تعظیم کرتے ہیں؟ (غالبًا یہ عرض کرنا مقصود ہوگا کہ روزہ رکھ کر تو ہم نے بھی اس دن کی تعظیم کی، گویا ہم ایک عمل میں ان کی مشابہت اختیار

کرنے لگے) تو اِس پرآپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر اللہ نے چاہا تو اگلے سال ہم نویں تاریخ کو بھی روزہ رکھیں گے''۔ (اس طرح سے مشابہت کا شبہ باقی نہیں رہے گا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کہ اگلا سال آنے سے پہلے ہی آپ ﷺ کا وصال ہوگیا۔''

اسی وجہ سے فقہاء کرامؒ فرماتے ہیں: صرف عاشورا کا روزہ نہ رکھا جائے، بلکہ اس کے ساتھ ۹ / یا ۱۱ محرم کا روزہ بھی ملالیا جائے، تاکہ یہود کے ساتھ مشابہت سے بچ سکیں، اس نبوی تعلیم سے یہ بات سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں کہ کسی کارِخیر میں بھی یہود سے مشابہت یا موافقت کو حضرت رسول اللہ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا؛ چہ جائیکہ! دوسری عادات یا معاملات میں ان سے مشابہت کو قبول کرلیا جائے! صحیح مسلم کی ہی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش بھی زمانہ جاہلیت میں عاشورا کا روزہ رکھتے تھے:

''عن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت: کانت قریش تصوم عاشوراء فی الجاهلیة، وکان رسول اللّٰه ﷺ یصومهٗ، فلما هاجر إلی المدینة صامهٗ وأمر بصیامه، فلما فرض شهر رمضان، قال: من شاء صامهٗ ومن شاء ترکهٗ''۔

(صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم عاشورا، رقم الحدیث: ۱۱۲۵، ج: ۲، ص: ۷۹۲، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں قریش روزہ رکھتے تھے اور جناب رسول اللہ ﷺ بھی روزہ رکھتے تھے، جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو وہاں بھی عاشوراء کا روزہ رکھا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا، پھر جب ماہِ رمضان میں روزہ رکھنے کی فرضیت کا حکم آیا تو آپ ﷺ نے لوگوں کو اختیار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''جو چاہے عاشورا کا روزہ رکھے، جو چاہے نہ رکھے''۔

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے قبل بھی حضور ﷺ کی اپنی عادت شریفہ روزہ رکھنے کی تھی اور ہجرت کے بعد دوسروں کو بھی تاکید فرمائی تھی۔

ماہِ محرم الحرام میں دوسرا حکم

عاشورا کے دن اپنے اہل وعیال پر کھانے پینے یا کسی بھی اعتبار سے وسعت کرنا، اس کی خاص فضیلت وارد ہے؛ چنانچہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''من وسَّع علی عیاله فی یوم عاشوراء، وسع اللّٰه علیه السنة کلها''۔

(شعب الإیمان للبیہقی، کتاب الصیام، صوم التاسع والعاشر، ج: ۳، ص: ۳۶۵)

ترجمہ: ''جو شخص عاشورا کے دن اپنے گھر والوں پر خرچ کرنے میں وسعت وفراخی کرے گا، اللہ تعالیٰ سارا سال اس پر (رزق میں) وسعت فرمائے گا۔''

اگرچہ اس حدیث کی اسنادی حیثیت پر کلام ہے، مگر محدثین کی تصریحات کے مطابق ایسی روایات جو مختلف طرق سے مروی ہوں، ان کی مختلف اسناد کی وجہ سے ان میں قوت پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے اس کو فضائل میں بیان کرنے پر کوئی بڑا اشکال باقی نہیں رہتا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کی روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

’’هذه الأسانيد وإن كانت ضعيفة، فهي إذا ضم بعضها إلى بعض، أخذت قوة، والله أعلم‘‘۔ (شعب الإیمان للبیہقی، کتاب الصیام، صوم التاسع والعاشر، ج:۳، ص:۳۶۵)

ترجمہ: ’’اگرچہ ان روایات کی سندوں میں ضعف ہے، لیکن ان میں مجموعی طور پر اتنی بات ضرور پائی جاتی ہے کہ ان اسانید کو ملا لیا جائے تو قوّت کی شکل بن جاتی ہے۔‘‘

محرم الحرام میں سوگ کرنے کا حکم

ایک اور چیز جس کا رواج عام طور پر بہت زیادہ ہو چکا ہے کہ یہ مہینہ غم کا مہینہ ہے، اس مہینے میں خوشی نہیں منانی چاہیے، کیوں؟! اس لیے کہ اس مہینے میں نواسۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے چھوٹوں اور بڑوں کو ظالمانہ طور پر نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا، ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے لیے غم منانا، سوگ کرنا اور ہر خوشی والے کام سے گریز کرنا ضروری ہے، سوچنا تو یہ ہے کہ ہمیں اس بارے میں شریعت کی طرف سے کیا راہنمائی ملتی ہے؟؟!!

اس بارے میں سب سے پہلے علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ملاحظہ کرتے ہیں:

’’فكل مسلم ينبغي له أن يُحزنهُ هذا الذي وقع من قتله رضي الله عنه، فإنه من سادات المسلمين وعلماء الصحابةؓ، وابن بنت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم التي هي أفضل بناته، وقد كان عابداً وشجاعاً وسخيا .... وقد كان أبوه أفضل منه، وهم لا يتخذون مقتله مأتَماً كيوم مقتل الحسينؓ، فإن أباه قتل يوم الجمعة وهو خارج إلى صلاة الفجر في السابع عشر من رمضان سنة أربعين، وكذالک عثمانؓ كان أفضل من عليؓ عند أهل السنة والجماعة، وقد قتل وهو محصور في داره في أيام التشريق من شهر ذي الحجة سنة ست وثلاثين، وقد ذُبح من الوريد إلى الوريد، ولم يتخذِ الناسُ يوم مقتله مأتمًا، وكذالک عمرؓ بن الخطاب، وهو أفضل من عثمانؓ وعليؓ، قتل وهو قائم يصلي في المحراب صلاة الفجر، وهو يقرأ القرآن، ولم يتخذ الناس يوم مقتله مأتما، ورسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سيد ولد آدم في الدنيا والآخرة، وقد قبضه الله إليه كما مات الأنبياء قبله، ولم يتخذِ أحد يوم موتهِ مأتما‘‘۔ (البدایۃ والنہایۃ، سنۃ إحدی وستین، فصل: فی الإخبار بمقتل الحسین بن علی رضی اللہ عنہ، ج:۱۱، ص:۵۷۹، دار الھجر للطباعۃ والنشر والتوزیع)

’’ہر مسلمان کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ غمگین کر

دے، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے سردار اور اہلِ علم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے ۔ آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے افضل لختِ جگر کے بیٹے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے، آپ عبادت کرنے والے، بڑے بہادر اور بہت زیادہ سخی تھے ۔ آپ کے والد (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ) آپ سے زیادہ افضل تھے، اُن کو چالیس ہجری سترہ رمضان جمعہ کے دن جب کہ وہ اپنے گھر سے نمازِ فجر کے لیے تشریف لے جارہے تھے' شہید کردیا گیا، اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے افضل ہیں، جنہیں چھیالیس ہجری عیدالاضحیٰ کے بعد انہی کے گھر میں شہید کردیا گیا، لیکن لوگوں نے ان کے قتل کے دن کو بھی اس طرح ماتم نہیں کیا، اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان دونوں حضرات (حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما) سے افضل ہیں، جن کو مسجد کے محراب میں نماز کی حالت میں جب کہ وہ قراءت کررہے تھے' شہید کردیا گیا، لیکن ان کے قتل کے دن بھی اس طرح ماتم نہیں کیا جاتا، اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو دنیا وآخرت میں بنی آدم کے سردار ہیں، ان کی وفات کے دن کو بھی کسی نے ماتم کا دن قرار نہیں دیا۔''

اس قول کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ سمجھنا چاہیے کہ ''شہادت'' کا مرتبہ خوشی کا ہے یا غم اور سوگ کا؟؟!! تعلیماتِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے تو یہ سبق ملتا ہے کہ شہادت کا حصول تو بے انتہا سعادت کی بات ہے:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا شوقِ شہادت

یہی وجہ تھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مستقل حصولِ شہادت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل مدینہ، باب کراہیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن تعری المدینۃ، رقم الحدیث: ۱۸۹۰، ج: ۳، ص: ۲۳، دار طوق النجاۃ)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا شوقِ شہادت

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنہیں بارگاہِ رسالت سے سیف اللہ کا خطاب ملا تھا، وہ ساری زندگی شہادت کے حصول کی تڑپ لیے ہوئے قتال فی سبیل اللہ میں مصروف رہے، لیکن اللہ کی شان انہیں شہادت نہ مل سکی، تو جب ان کی وفات کا وقت آیا تو پھوٹ پھوٹ کے رو پڑے کہ میں آج بستر پر پڑا ہوا اونٹ کے مرنے کی طرح اپنی موت کا منتظر ہوں۔ (البدایہ والنھایہ، سنۃ احدی وعشرین، ذکر من توفی احدی وعشرین، ج: ۷، ص: ۱۱۴، مکتبۃ المعارف، بیروت)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شوقِ شہادت

شہادت تو ایسی عظیم سعادت اور دولت ہے، جس کی تمنا خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے کی اور امت کو بھی اس کی ترغیب دی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: ’’میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، پھر شہید کر دیا جاؤں، (پھر مجھے زندہ کر دیا جائے) پھر میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں اور شہید کر دیا جاؤں (پھر مجھے زندہ کر دیا جائے) پھر میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں اور پھر شہید کر دیا جاؤں‘‘۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ، رقم الحدیث: ۴۹۶۷)

الغرض یہاں تو صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ شہادت تو ایسی نعمت ہے جس کے حصول کی شدت سے تمنا کی جاتی تھی، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر افسوس اور غم منایا جائے، اگر اس عمل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں بتلایا جائے کہ پورے سال کا ایسا کون سا دن ہے جس میں کسی نہ کسی صحابیِ رسول کی شہادت نہ ہوئی ہو، کتبِ تاریخ اور سیر کو دیکھ لیا جائے، ہر دن میں کسی نہ کسی کی شہادت مل جائے گی، جس کا مقتضا یہ ہے کہ اس دن کو اظہارِ غم اور افسوس بنایا جائے، نیز! اس بات کو بھی دیکھا جائے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں بھی تو کئی عظیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب شخصیات کو شہادت ملی، لیکن کیا ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی شہادت کے دن کو اس طرح منایا؟؟!! نہیں! بالکل نہیں! تو پھر کیا ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ غم محسوس کرنے والے ہیں؟؟!! خدارا! ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اس قسم کی رسومات اور فضول اعمال سے بچنے کی مکمل کوشش کریں۔

محرم الحرام میں شادی کرنے کا حکم

اوپر ذکر کی گئی تفصیل کے مطابق اس ماہِ مبارک میں سوگ کرنا بالکلیہ بے اصل اور دین کے نام پر دین میں زیادتی ہے، جس کا ترک لازم ہے، لہٰذا جب سوگ جائز نہیں ہے تو پھر شرعاً اس مہینے میں شادی کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ عجیب بات تو یہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے شادی اسی ماہِ مبارک میں ہوئی۔ (ملاحظہ ہو: تاریخ مدینۃ الدمشق لابن عساکر، باب ذکر بنیہ وبناتہ علیہ الصلاۃ والسلام وأزواجہ، ج: ۳، ص: ۱۲۸، دار الفکر۔ تاریخ الرسل والملوک للطبری، ذکر ما کان من الأمور فی السنۃ الثانیۃ، غزوۃ ذات العشیرۃ، ج: ۲، ص: ۴۱۰، دار المعارف بمصر)

اس مہینے میں شادی نہ ہونے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اس مہینے میں نحوست ہے، جب کہ شرعاً یہ بات بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے، بلکہ یہ عقیدہ یا ذہن رکھنا ہی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی دن یا زمانے میں کسی قسم کی نحوست نہیں رکھی گئی۔ اکابرین مفتیانِ عظام کے فتاویٰ میں اس کی تصریحات موجود ہیں، ذیل میں فتاویٰ رحیمیہ سے اسی مسئلے کا جواب نقل کیا جاتا ہے:

’’(الجواب): ماہ محرم کو ماتم اور سوگ کا مہینہ قرار دینا جائز نہیں، حدیث میں ہے کہ عورتوں کو ان کے خویش واقارب کی وفات پر تین دن ماتم اور سوگ کرنے کی اجازت ہے اور اپنے

شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ منانا ضروری ہے، دوسرا کسی کی وفات پر تین دن سے زائد سوگ منانا جائز نہیں، حرام ہے، آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

''لا یحل لامرأة تؤمن باللّٰہ والیوم الآخر أن تحد علی میت فوق ثلٰث لیال إلا علٰی زوج أربعة أشهر وعشراً۔'' (بخاری، باب: تحد المتوفی عنها أربعة أشهر وعشراً إلخ، ص:۸۰۳، ج:۲)

ترجمہ: ''جوعورت خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھے، اس کے لیے جائز نہیں کہ کسی کی موت پر تین رات سے زیادہ سوگ کرے، مگر شوہر اس سے مستثنیٰ ہے کہ اس کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ کرے۔''

ماہِ مبارک محرم میں شادی وغیرہ کرنا نامبارک اور ناجائز سمجھنا سخت گناہ اور اہل سنت کے عقیدے کے خلاف ہے۔ اسلام نے جن چیزوں کو حلال اور جائز قرار دیا ہو، اعتقاداً یا عملاً ان کو ناجائز اور حرام سمجھنے میں ایمان کا خطرہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ خوب احتیاط برتیں، ان رسومات سے علیحدہ رہیں، اس لیے کہ ان میں شرکت حرام ہے۔

''مالابدمنہ'' میں ہے: ''مسلم را تشبہ بہ کفار وفساق حرام است۔'' یعنی: ''مسلمانوں کو کفار وفساق کی مشابہت اختیار کرنی حرام ہے۔'' (ص:۱۳۱)

ماہ مبارک میں شادی وغیرہ کے بارے میں دیوبندی اور بریلوی میں اختلاف بھی نہیں ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا فتویٰ پڑھیے:

''(سوال) بعض سنی جماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر میں روٹی پکاتے ہیں اور نہ جھاڑو دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ بعد دفن تعزیہ روٹی پکائی جائے گی۔ ۲: ان دس دن میں کپڑے نہیں اتارتے۔ ۳: ماہِ محرم میں کوئی بیاہ شادی نہیں کرتے، اس کا کیا حکم ہے؟

(الجواب) تینوں باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے۔'' (احکام شریعت، ص:۹۰، ج:۱)

فقط واللہ اعلم بالصواب۔'' (فتاوی رحیمیہ، کتاب البدعة والسنة، ج:۲، ص:۱۱۵، دارالاشاعت، کراچی)

اسی طرح فتاویٰ حقانیہ (کتاب البدعة والرسوم، محرم الحرام میں شادی کرنے کا حکم؟ ج:۲، ص:۹۶، جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک) میں بھی موجود ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر طرح کے منکرات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، اور افراط وتفریط سے بچتے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے، آمین۔

تعلیمی اداروں میں سزا کا اسلامی تصور

مولانا سعید الحق جدون

تعلیمی اداروں میں تعلیم کے لیے تشدد اور مار پیٹ کا تصور بہت شدید قسم کی وابستگی رکھتا ہے، لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ سخت مار کے بغیر بچے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ ایک غلط تصور ہے، اس سے بچے کو تعلیم سے نفرت بھی ہو سکتی ہے اور تعلیمی سلسلے کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ بھی جاتے ہیں۔

درس و تدریس کے سلسلے میں قرآنی تعلیمات یہ ہیں کہ آپ نرم خوئی اور رحم دلی سے کام لیں اور درشت مزاجی سے گریز کریں۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر علیہ السلام کو فرماتے ہیں:

''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔''(۱)

''پس اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر آپ لوگوں کے لیے نرم خو ہو گئے اور اگر آپ درشت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔''

اسی طرح پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:

''میں ہر معاملہ میں آسانی کرنے والا استاذ بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''(۲)

ان واضح ارشادات کی روشنی میں تعلیم کو مارنے سے نہیں، بلکہ پیار سے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج المیہ یہ ہے کہ بعض اساتذہ بچوں کو بڑی بے رحمی سے مارتے ہیں اور جب چھڑی اٹھاتے ہیں تو پھر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے ہیں، ان کو اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ چھڑی بچے کے جسم پر کہاں لگ رہی ہے، اس سے نقصان کا کس قدر اندیشہ ہے۔ بعض اساتذہ کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بچوں کی ہڈی پر زور زور سے چھڑیاں مارتے ہیں، بچوں کو تھپڑ، مکے، گھونسے اور لاتیں مارتے ہیں۔ بچوں کے ہاتھ پاؤں کو بے دردی سے مروڑتے ہیں۔ یہ سب چیزیں قرآن وسنت، خلف وسلف کے افکار اور فقہ اسلامی کے سراسر خلاف ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ طلباء کرام کو جرائم پر سزا دی جاسکتی ہے۔ اس طرح علم وادب سکھانے کے لیے بھی بقدرِ ضرورت سزا کی اجازت ہے، جس کے لیے شریعت نے حد مقرر کی ہے۔ جرائم پر سزا کا تصور قرآن نے تسلیم کیا ہوا ہے، مثلاً خاوند کو اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تعظیم کے دائرے میں

رکھے۔نفسیاتی سزا کے طور پر اس سے ہم بستری نہ کرے۔اگر نفسیاتی سزا بے اثر ہوتی ہے تو اُسے معمولی طور پر جسمانی سزا دے سکتا ہے۔ باپ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بچوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے مارے۔ اس معاملہ میں جس حدیث کا حوالہ آتا ہے اس کے مطابق بچوں کو سات سال کی عمر میں کہنا چاہیے کہ وہ نماز پڑھیں اور دس سال کی عمر میں انہیں مارنے کا بھی حق ہے۔شارحین حدیث نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ بچوں کو تعلیمی اداروں میں مارنا اسلامی تعلیمات سے روگردانی نہیں ہے، البتہ کڑی سزا اور بچوں کو مرعوب کرنے کے لیے موقع بے موقع ڈنڈا چلانا مضر اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

سزا فقہ اسلامی کی روشنی میں

فقہ اسلامی میں یہ تصریح موجود ہے کہ اساتذہ کی اول ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ اپنے شاگردوں کو بہت شفقت سے پڑھانے کا اہتمام کریں، وقتاً فوقتاً ان کو ترغیب دینے اور شوق دلانے کا سلسلہ رکھیں۔ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو زبانی سمجھانے کی کوشش کریں۔اگر سمجھانا مفید نہ ہو تو زبانی تنبیہ کریں، کچھ ڈانٹ پلا دیں (لیکن تنبیہ اور ڈانٹ میں غیر مہذب کلمات استعمال کرنے سے اجتناب کریں) اگر یہ بھی مفید نہ ہو تو پھر بوقتِ ضرورت بقدرِ ضرورت سزا دینے کی بھی گنجائش ہے، مگر سزا دینے میں چند باتوں کی احتیاط کی جائے:

ا:.....اتنا نہ مارا جائے کہ جسم پر کوئی گہرا نشان ہو جائے۔علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''إذا ضرب المعلم الصبی ضربًا فاحشًا فإنه یعزر و یضمنه لومات۔''(۳)

''جب استاد بچے کو سخت مارے تو اس استاد کو تعزیر کی جائے گی، اگر بچہ مر گیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔''

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''لیس لہ أن یضربها فی التأدیب ضربًا فاحشًا وهوالذی یکسر العظم أویحرق الجلد أو یسوّدهٗ۔''(۴)

''استاد کے لیے یہ جائز نہیں کہ شاگرد کو ادب دلانے کے لیے سخت مارے، سخت مارنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ہڈی ٹوٹے، کھال اُکھڑے یا کھال سیاہ ہو جائے۔''

۲:.....سزا بچے کے تحمل سے زیادہ نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معلم سے فرمایا:

''إیّاک أن تضرب فوق الثلاث فإنک إذا ضربتَ فوق الثالث اقتص اللّٰہُ منک۔''(۵)

''تین ضرب سے زیادہ مت مارو، اگر تم تین ضرب سے زیادہ مارو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے قصاص لے گا۔''

۳:..... چہرے پر نہ مارا جائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے پر مارنے سے منع فرمایا ہے۔ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: چہرے پر مارنے کی ممانعت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ یہ اعظم الاعضاء ہے

اور اجزاء شریفہ اور لطیفہ پر مشتمل ہے، اگر کسی نے چہرے پر تھپڑ مارا تو اس پر ضمان لازم ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر تصریح کی ہے:

’’فلو ضربهٗ علی الوجه أو علی المذاکیر یجب الضمان بلاخلاف ۔‘‘(۶)

’’اگر کسی کو چہرے پر مارا یا اندام مخصوصہ پر تو اس پر بغیر کسی خلاف کے ضمان واجب ہوگی۔‘‘

۴:..... بلاقصور نہ مارا جائے۔ اگر کسی استاد نے بلاقصور بچے کو مارا تو یہی استاذ سزا پانے کے قابل ہے۔ شامی میں ہے:

’’إذا ضربها بغیر حق وجب علیه التعزیر وإن لم یکن فاحشا ۔‘‘(۷)

’’جب (بچے) کو بغیر قصور مارا تو اس پر تعزیر واجب ہوگی، اگرچہ اس نے سخت نہیں مارا ہو۔‘‘

درمختار کے اس قول ’’لهٗ إکراه طفله علی تعلیم القرآن وأدب وعلم‘‘ سے معلوم ہوتا ہے کہ بدتمیزی کرنا اور سبق میں کوتاہی کرنا دونوں قصور ہیں جن کی وجہ سے بچوں کو سزا دینا جائز ہے۔

۵:..... سزا ضربِ معتاد سے زیادہ نہ ہو خواہ کیفاً ہو (جیسے بچے کو الٹا مارنا) خواہ کماً ہو (جیسے تین ضربوں سے زیادہ مارنا) خواہ محلاً ہو (جیسے چہرے اور اندام مخصوصہ پر مارنا) شامی میں ہے کہ اگر کسی نے ضرب معتاد سے زیادہ مارا تو اس پر ضمان واجب ہوگا۔

سزا اور جدید تعلیمی نفسیات کی تحقیق

جدید تعلیمی نفسیات کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ طلبہ کو اخلاقی جرائم پر سزا دی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ جسمانی سزا طلبہ کے تعلیمی عمل پر بُرا اثر ڈالتی ہے، لہٰذا حتیٰ الامکان جسمانی سزا سے معلم گریز کرے۔ سزا طالب علم کی عزتِ نفس اور خودداری مجروح کرتی ہے۔ استاد کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے اور بسا اوقات طالب علم سلسلۂ تعلیم ہی ختم کردیتا ہے، لہٰذا استاد کو بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: تدریس کے دوران استاد کو طالب علم کی نفسیات کے مطابق اپنے تدریسی امور سرانجام دینے چاہئیں۔

مسلمان مفکرین: تعلیم اور سزا

۱:..... ابن خلدونؒ

خوب یاد رکھیے! تعلیم کے سلسلے میں بے جا مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ مضر ہے، خصوصاً چھوٹے بچوں کے حق میں، کیونکہ یہ استاد کی نااہلی اور غلط تربیت کی نشانی ہے۔ جن کی نشو ونما ڈانٹ ڈپٹ اور قہر وتشدد سے ہوتی ہے، خواہ وہ پڑھنے والے بچے ہوں یا لونڈی غلام یا نوکر چاکر، ان کے دل ودماغ پر استاد کا قہر ہی چھایا ہوتا ہے۔ بے چاروں کی طبیعت بجھ کر رہ جاتی ہے، امنگ وحوصلہ پست ہوجاتا ہے، شوق

www.banuri.edu.pk

ودلچسپی جاتی رہتی ہے اور طبیعت میں مستی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو دماغ معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ تشدد سے جھوٹ اور بدباطنی پیدا ہوتی ہے اور خودداری سلب ہو جاتی ہے، گویا جبر وتشدد بچوں کو مکر وفریب اور دغابازی کی تعلیم دیتا ہے۔ (۸)

۲ ...... امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

استاد کو بچوں کی بدسلوکی پر نصیحت کرنا چاہیے، لیکن سزا کے معاملے میں اُسے کھلے عام اور طوالت سے پرہیز کرنا ہوگا، کیونکہ اس سے طالب علم اور استاذ کے درمیان احترام کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ (۹)

۳ ...... ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ

استاذ کو کڑی سزا دینے کا حق نہیں، تاوقتیکہ وہ اس کے والد یا سرپرست سے اجازت نہیں لے لیتا۔ (۱۰)

۴ ...... معلم تیونس Al.Qalishi

استاد صاحب ناراض ہو تو اس حالت میں اس کو مارنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسے موقع پر اس کے ذاتی احساسات حالات کو مسخ کرسکتے ہیں۔ اسی معلم نے ایک اور اصول پر زور دیا ہے، وہ یہ ہے کہ استاذ کو ذاتی وجوہات کی بنا پر سزا نہیں دینی چاہیے۔ (۱۱)

۱:...... آل عمران: ۱۵۹۔ ۲:..... مسلم، ج:۲، ص:۱۱۰۴۔ ۳:.....الدر المختار، ج:۴، ص:۷۹، دارالفکر بیروت۔
۴:.....ردالمحتار، ج:۴، ص:۷۹۔ ۵:.....بحوالہ ردالمحتار، ج:۶، ص:۴۲۶۔ ۶:.....ردالمحتار، ج:۶، ص:۵۶۶۔
۷:.....فتاویٰ شامی، ج:۴، ص:۷۹۔ ۸:.....مقدمہ ابن خلدون، حصہ دوم، ص:۴۶۵۔
۹:.....اردو ترجمہ اسلامک سسٹم آف ایجوکیشن، ط: مجید بک ڈپو، لاہور، ص:۴۷۳ تا ۴۲۳۔ ۱۰:.....ایضاً۔ ۱۱:.....ایضاً۔

’’بیسی‘‘ اور ’’کمیٹی‘‘ سسٹم کی شرعی حیثیت

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ:

ا:.....آج کل معاشرے میں رائج ’’بیسی سسٹم‘‘ یا ’’کمیٹی سسٹم‘‘ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آیا ’’بیسی اور کمیٹی‘‘ سود کے زمرے میں آتی ہے یا نہیں؟

۲:..... ہمارے ہاں ایک دوست ’’بیسی‘‘ کا انتظام کرتے ہیں، جس کے کل ارکان دس ہیں۔ ہمارے دوست ہر ماہ تمام ممبران سے رقم وصول کرکے بذریعہ قرعہ اندازی نکلنے والے ممبران کے حوالے کرتے ہیں، لیکن ہر مرتبہ وہ مجموعی رقم سے ۵۰۰ روپے اپنی جیب میں ڈالتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ میرا حق ہے، کیونکہ میں سب کو فون کرتا ہوں، ان سے پیسے وصول کرتا ہوں، اس پر خرچہ ہوتا ہے اور وقت لگتا ہے، اس لیے ۵۰۰ روپے خود لیتا ہوں۔ ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ العارض: محمد عبید

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

ا:.....صورتِ مسئولہ میں ’’بی سی‘‘ یا ’’کمیٹی‘‘ کا نظام شرعاً درست ہے، اس کی حیثیت قرض کی ہے، ہر شریک اتنی ہی رقم کا مستحق ہوتا ہے جتنی وہ مجموعی اعتبار سے جمع کرائے گا۔ ہاں! اگر اس میں شرائط لگائی جائیں کہ کسی کو کم، کسی کو زیادہ یا بولی لگا کر فروخت کی جائے تو یہ صورتیں درست نہیں، یہ سود کے زمرے میں داخل ہوں گی۔

۲:.....کمیٹی جمع کرنے والا ممبر خود بھی کمیٹی میں شریک ہے تو اس کے لیے ہر ماہ ۵۰۰ روپے رکھ لینا جائز نہیں، یہ قرض پر نفع ہے جو کہ حرام ہے۔ اگر کمیٹی کے ممبران سمجھتے ہیں کہ یہ جمع کرنے والا شخص واقعتاً محنت ومشقت کرتا ہے تو الگ سے اس کے لیے اجرت مقرر کرسکتے ہیں، کمیٹی کی رقم سے نہیں۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

’’**وفي الاشتباه كل قرض جر نفعًا حرام (قوله كل قرض جر نفعا حرام) أي إذا كان مشروطاً**۔‘‘ (فتاویٰ شامی، ج:۵،ص:۱۶۶، ط:سعید) فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد شفیق عارف	عبدالحمید

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

تجربہ ایک اچھا استاد ہے، لیکن اس کی اجرت گراں ہے۔ (کہاوت)

www.banuri.edu.pk